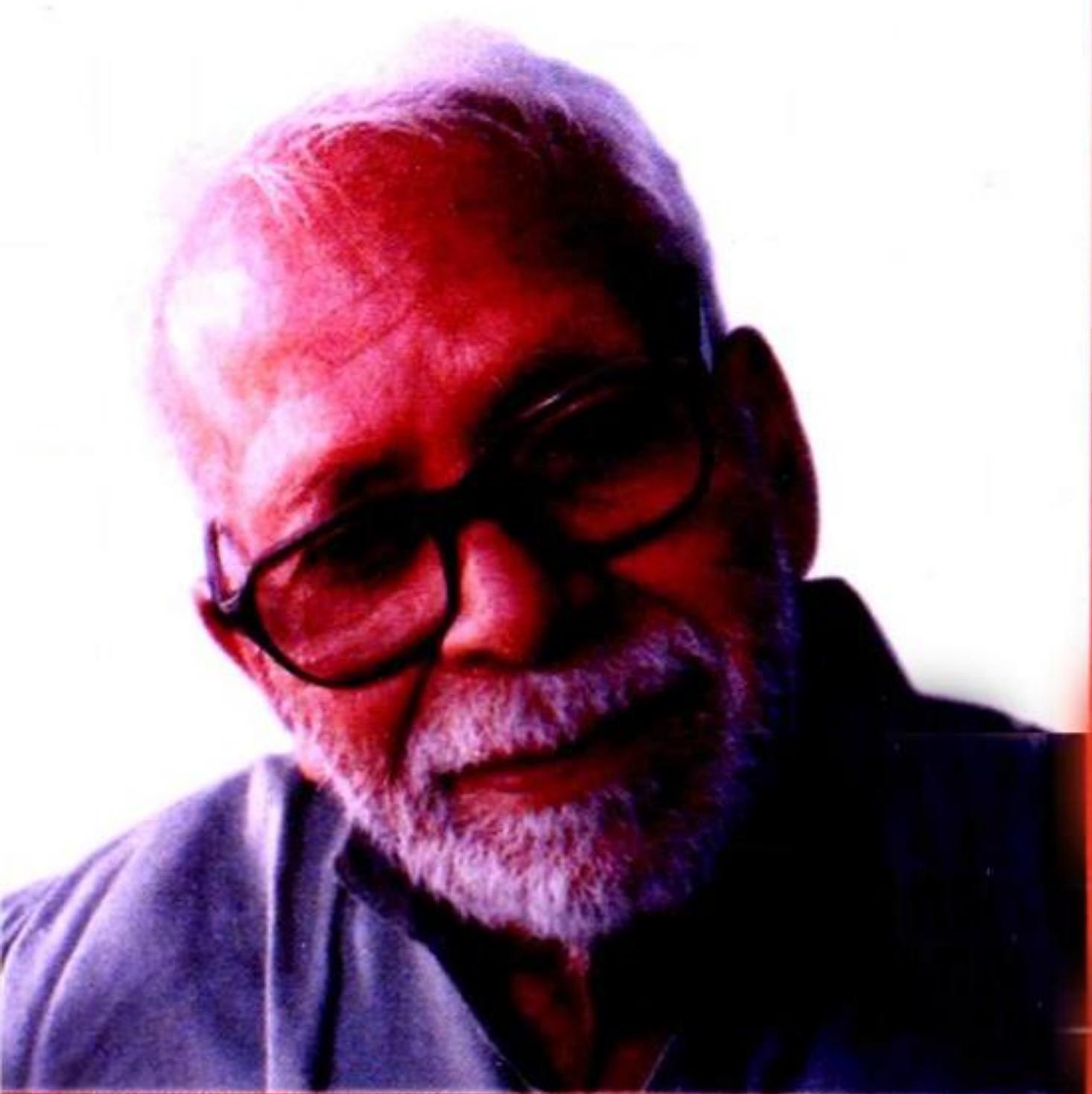


ہندستانی ادب کے معمار



# آل احمد سرور

امتیاز احمد



آل احمد سرور



ہندوستانی ادب کے معمار

# آل احمد سرور

امتیاز احمد



سادھتیہ اکادمی

**Aale Ahmad Suroor :** A monograph in Urdu by Imtiyaz Ahmad on the Urdu author. Sahitya Akademi, New Delhi (2005), Rs. 25.

© ساہتیہ اکادمی

پہلا ایڈیشن : 2005

## ساہتیہ اکادمی

ہائیڈ آفس :

رویندر بھون، 35 فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی 110 001

سیس آفس: 'سواتی'، مندر مارگ، نئی دہلی 110 001

علاقائی دفاتر :

جیون تارا بھون، 23 اے/44 ایکس، ڈائمونڈ ہاربر روڈ، کوکا ٹا 700 053

مبئی مراٹھی سنگھر اے مارگ، دادر، ممبئی 400 014

سینٹرل کالج کیمپس، ڈاکٹر بی۔ آر۔ امیڈ کرویدھی، بنگور 560 001

مین بلڈنگ، گونا بلڈنگ (دوسری منزل)، (304) 443، اسلامی، تینم پیٹ، چینی 600018

قیمت: 25 روپے

ISBN 81-260-2074-1

Website : <http://www.sahitya-akademi.org>

کمپوزنگ: پرس گرافس، نئی دہلی 25

طابع: آر۔ کے۔ آفیٹ پروسیس، دہلی

## فہرست

7	حیات
25	شخصیت
42	شاعری
54	ادبی صحافت
67	دانشوری
83	تلقید
97	کتابیات
101	میں شکر گزار ہوں

## حیات

(۱)

آل احمد سرور، اتر پردیش کے مشہور شہر بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد مصر کے علاقہ فرشور سے ہندوستان آئے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب خود ان کے مطابق حضرت عبدالرحمن بن ابو بکرؓ سے ملتا ہے۔ ان کے لکڑادا مولوی ذکراللہ شاہ اپنے زمانے کے مشہور بزرگ تھے۔ ان کے والد کا نام محمد اشرف اور پیر کا نام سید آل احمد مارہوی تھا۔ انھیں کے نام کی رعایت سے سرور صاحب کا نام آل احمد رکھا گیا۔

سرور صاحب کے والد کرم احمد ایم اے او کانج علی گڑھ (موجودہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے طالب علم تھے۔ یہاں سے ایف اے کرنے کے بعد انھوں نے ڈاک خانے میں ملازمت کر لی تھی۔ ان کی شادی سر سید کے ایک منافق مولوی علی بخش شر کے خاندان میں ہوئی تھی۔ اس رشتہ ازدواج سے انھارہ بچے پیدا ہوئے۔ ان میں سے صرف چھ زندہ رہ سکے۔ سرور صاحب ان چھ میں تیسرا تھے۔ بڑے بھائی کا نام ابن احمد تھا۔ وہ ڈاکخانہ میں ملازم تھے۔ ۱۹۷۰ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چھوٹے بھائی اولاد احمد آج بھی بقید حیات ہیں۔ شعبہ اقتصادیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے اپنی مدت ملازمت ختم کرنے کے بعد سرور صاحب کے گھر کے قریب سر سید نگر، علی گڑھ، یونیورسٹی میں مقیم ہیں۔ باقی تین بھنوں میں دو اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں۔ سب سے چھوٹی پاکستان کے شہر کراچی میں مقیم ہیں۔

آل احمد سرور، ۱۵ ار رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ/ ۹ ستمبر ۱۹۱۱ء کو اپنے وادھیاں میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ خوبصورت ناک نقشہ کی ایک دبلي پتلی خاتون تھیں۔ اپنے

میکے والوں سے ان کی انسیت غیر معمولی تھی۔ اس لیے اپنے بچوں پر وہ نبتاب کم توجہ دیتی تھیں۔ پانچ برس کی عمر میں سرور صاحب کو مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ مولانا عبدالقدیر نے رسم بسم اللہ ادا کی۔ پھر مولوی فیض بخش نے قرآن شریف کے تین چار پارے، آمدناہمہ اور کریما پڑھائی۔ اب تک یہ خاندان سرور صاحب کی نخیال میں رہتا تھا۔ گلستان کا سبق شروع ہی ہوا تھا کہ سرور صاحب کے والد کا تبادلہ اللہ آباد سے میرٹھ ہو گیا۔ اس تبادلہ کے ساتھ ہی سرور صاحب کی والدہ اور تمام بھائی بھن ان کے ساتھ رہنے لگے۔ پھر میرٹھ سے پہلی بھیت، بجنور، سیتاپور اور گونڈا ہوتے ہوئے سرور صاحب کا خاندان غازی پور پہنچا جہاں سے انہوں نے ۱۹۲۸ء میں بانی اسکول کا امتحان پاس کیا۔

اسی سال، یعنی جولائی ۱۹۲۸ء میں سینٹ جانس کالج آگرہ میں فرست ایئر سائنس میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۲ء میں یہیں سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ B.Sc. F.Sc. اور دونوں امتحانوں میں سرور صاحب کو سینند کلاس ملا۔ دل برداشتہ ہو کر انہوں نے سائنس کی تعلیم چھوڑ دی اور انگریزی زبان و ادب میں ایم اے کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی دوران ان کے والد کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا۔ ان کے ساتھ پورا خاندان علی گڑھ آگیا۔ سرور صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم اے انگریزی میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے اس آل احمد سرور کی داستان شروع ہوئی جسے دنیا ایک نقاد، شاعر اور دانشور کی حیثیت سے جانتی ہے۔

## (۲)

۱۹۱۶ء کا سال اپنا رخت سفر باندھ رہا تھا کہ سرور صاحب کے والد کا تبادلہ میرٹھ ہو گیا۔ اس شہر نے سرور صاحب کو بہت خوشگوار یادیں دیں: پڑوس کے ایک ڈاکٹر صاحب کی، دو تین سال بڑی ایک لڑکی اور جامن، کھرنی اور کھجور کے پیڑ کی۔

پھر ۱۹۱۹ء آگیا۔ سرور صاحب کے والد پہلی مرتبہ پوسٹ ماسٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ڈاکخانہ سے ملحق مکان ملا۔ سرور صاحب کو ایک مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ جہاں ایک سو سال میں انہوں نے قرآن شریف ختم کر لیا۔ فرصت کے اوقات میں ڈاکخانہ کا ایک چپر اسی انھیں رامائی اور مہابھارت کے قصے سناتا۔

پوت کے پاؤں پالنے میں ہی دکھائی دینے لگے۔ سرور صاحب کم سنی میں ہی کتابوں کے عشق میں بنتا ہو گئے۔ گیارہ بارہ سال کی عمر میں طسم ہوش ربا، مقدمہ ابن خلدون، مراثۃ العروض، فسانہ آزاد اور توبۃ النصوح جیسی کتابیں پڑھنے لگے۔ ذا کفانہ کا ایک ہر ک عاصی تخلص کرتا تھا۔ وہ انھیں اپنا کلام سنانے لگا۔ سرور صاحب نے اس کے کئی غیر موزوں مصروعوں کو ذرا سی تبدیلی سے موزوں کر دیا۔ ۱۹۲۸ء تک پہنچتے پہنچتے انھیں اچھے خاصے اشعار یاد ہو گئے تھے اور وہ چھوٹی مولیٰ تقریریں بھی کرنے لگے تھے۔ کچھ اشعار بھی موزوں کر لیتے تھے۔ یہ اشعار اسی زمانہ کی یادگار ہیں جو انھوں نے اپنی خودنوشت میں نقل کیے ہیں:

مدت کے بعد ماہوم نے کھلوائے آج آم کھانے کو زیادہ تھے ولے کم کھا کے رہ گئے  
کھانا ضرور تھا ہمیں کچھ ان کے سامنے دندان شکن تھے آم تو غم کھا کے رہ گئے

شروع میں ارشد تخلص کیا لیکن بعد میں سرور تخلص کرنے لگے۔

سینٹ جانس کالج آگرہ نے ایک طرف انھیں معین احسن ملال سے ملوا یا جو بعد میں جذبی بنے تو دوسری طرف اسرار الحق مجاز اور تیسری طرف حامد حسن قادری سے۔ یہیں سینٹ جانس کالج کی میگزین میں سرور صاحب کی پہلی غزل شائع ہوئی۔ یہیں وہ مانی جائی، فانی بدایوںی، میکش اکبر آبادی، مخمور اکبر آبادی اور سیما ب اکبر آبادی وغیرہ سے واقف ہوئے۔ یہیں انھوں نے آب حیات اور گل رعناء پڑھی۔ بشپ فرقہ ہو شل کی میگزین کے ایڈیٹر اور کالج کی انجمن اردوئے معلیٰ کے سکریٹری مقرر ہوئے۔

### (۳)

جس ہیرے کی چکا چوند سے آنکھوں کو آگے چل کر خیرہ ہونا تھا اس کی ابتدائی تراش خراش کا کام سینٹ جانس کالج آگرہ کر چکا تھا۔ اب وہ آخری تراش خراش کے لیے تیار تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اسے وہ جوہری مہیا کر دیے۔ رشید احمد صدیقی، خوبجہ منظور حسین اور ڈاکٹر ڈاکٹر حسین وہ جوہری تھے جنھوں نے اس ہیرے کو تراش خراش

کر بہشت پہلو ہنا دیا۔

علی گڑھ کی فضا سر سید کے خوابوں، آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں کے ساتھ ساتھ ان کی آہ سحرگاہی اور دعائے نیم شمی، بے پناہ خلوص، نیک نیتی، قربانی اور وسعت قلب و نظر کی داستان سے لبریز تھی۔ وہاں کی فضاؤں میں سر سید کے ساتھ ساتھ حالی، بیتلی، نذری، احمد، وقار الملک، محسن الملک، مولوی سمیع اللہ، جسٹس سید محمود، رجہ بے کشن داس، مولوی زین العابدین، مولوی ذکاء اللہ، مولوی چرانی علی، سر نامس آرنلڈ، تھیودور بیک، تھیودور ماریسک، ڈبیو اے بے آرچبولڈ، حاجی اسماعیل، بے ایچ ٹول، سر رضا علی، میر ولایت حسین، سید طفیل احمد منگوری، سروالزریلے، صاحبزادہ آفتباپ احمد خاں اور دوسرے ناموروں کی آوازیں اب تک گونج رہی تھیں۔ اس ما جوں میں سرور صاحب نے علی گڑھ کی سرزیں پر قدم رکھا۔ بدایوں سے وہ اپنے ساتھ ملا عبد القادر بدایوں کی علمیت اور حضرت نظام الدین اولیا کی روحانیت لائے تھے۔ یہ نت جانس کا لج آگرہ نے انھیں سائنسی نظر اور جدید دور کے تقاضوں سے آشنا کیا۔ باقی رہی سبھی کسر علی گڑھ نے پوری کر دی۔

سرور صاحب کو ایم اے انگریزی میں داخلہ لیے مشکل سے ایک مہینہ ہوا تھا کہ خوبجہ منظور حسین، ریڈر شعبۂ انگریزی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے جو اس وقت علی گڑھ میگزین کے نگران تھے انھیں علی گڑھ میگزین کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ اور مضمون لینے کے لیے رشید احمد صدیقی، اشراق حسین اور بشیر باشمی وغیرہ سے ملنے کا مشورہ دیا۔ اس حکم کی تعیین کرتے کرتے وہ رشید احمد صدیقی کے قرب کی اس دولت سے سرفراز ہو گئے جو کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی۔ اس قرب نے انھیں اردو کے تمام بڑے شاعروں اور ادیبوں سے تھوڑے ہی عرصہ میں واقف کر دیا۔ وہ ان کی صحبت میں بیٹھتے، ان کی باتیں سنتے اور ان سے مستفیض ہوتے رہتے تھے۔ رشید احمد صدیقی ان کی تعریف میں رطب المسان رہتے۔ وقت گزرتا گیا۔ پہلے سال میں سرور صاحب نے علی گڑھ میگزین کے چار شمارے مرتب کیے، شعبۂ انگریزی کی انجمن رائے لٹریری سوسائٹی کے سکریٹری بھی مقرر ہوئے۔ اس کے کئی جلسے کرائے، یونیورسٹی کے مباحثوں میں شرکت کی اور انعامات حاصل کیے۔ دوسرے سال، ایم اے سال آخر میں اسٹوڈنٹ یونیورسٹی کے ایکشن میں نائب صدر کے امیدوار

ہوئے (اس زمانے میں اسٹوڈنٹ یونین کے صدر پرووسائس چانسلر ہوتے تھے) اور کامیابی حاصل کی۔ اس طرح دوسرا سال یونین کی کارگزاریوں کی نذر ہو گیا۔ پھر بھی ایم اے سال آخر کے امتحان میں انھیں فرست کلاس ملا۔

اسی سال شعبہ انگریزی کے ایک استاد غلام سرور کے انگلستان جانے کی وجہ سے شعبہ میں ایک جگہ خالی ہوئی جس پر اکتوبر ۱۹۳۲ء سے سرور صاحب کا تقرر ہو گیا۔ شروع ۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے مشورے سے انھوں نے اردو میں ایم اے کر لیا اور جولائی ۱۹۳۶ء میں شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جو نیز پکھر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ ۱۹۳۸ء میں مولانا احسن مارہروی کے ریناٹر ہونے کے بعد اگست ۱۹۳۸ء میں سرور صاحب سینئر پکھر بنادیے گئے۔

اسی دوران ۱۹۳۶ء میں رشید احمد صدیقی کے ساتھ مل کر سرور صاحب نے رسالہ 'سمیل' کا ایک خاصاً نجیم نمبر مرتب کیا۔ اس شمارے کے اداریہ میں رشید احمد صدیقی نے بہت کھل کر ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ ایک سال پہلے ۱۹۳۵ء میں سرور صاحب کا پہلا شعری مجموعہ 'سمیل' کے نام سے شائع ہو چکا تھا۔ اس کا پیش لفظ بھی رشید صاحب نے لکھا تھا۔ 'سمیل' کے مذکورہ شمارہ میں سرور صاحب کی کئی تحریریں شامل تھیں۔ علی گڑھ میگزین میں بھی انھوں نے یونیورسٹی کے حالات کے علاوہ 'انگارے' پر ایک بہت سخت مضمون لکھا تھا۔ اور بعض کتابوں پر تبصرے بھی کیے تھے۔ 'سمیل' میں کتابوں کی یہ تعداد اٹھارہ (۱۸) تک پہنچ گئی۔ ساتھ ہی سات مرحومین پروفیسیات، اقبال پر ایک مضمون اور اردو ادب کی عمومی صورت حال پر ایک تبصرہ بھی شامل تھا۔

۱۹۳۷ء میں پکھر گریڈ II کی حیثیت سے سرور صاحب کی ملازمت مستغل ہو گئی۔ اسی کے ساتھ وہ یونیورسٹی گزٹ کے معاون مدیر بھی مقرر ہو گئے۔ اس کے لیے انھیں پچاس روپے ماہانہ الاؤنس ملتا تھا۔ اس زمانے میں گزٹ کا ایڈیٹر و اس چانسلر ہوتا تھا۔ یہ بنیادی طور پر یونیورسٹی کا خبرنامہ تھا جو آج بھی شائع ہوتا ہے۔ اس میں یونیورسٹی کی خبروں کے علاوہ کچھ مختصر مضمایں، علمی کوائف اور اداریہ ہوتا تھا۔ لگ بھگ پانچ مہینے سرور صاحب اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ اس کے بعد رحم علی البائی جو اس عہدے پر کام کرتے تھے

چھٹی سے واپس آگئے اور سرور صاحب اس ذمہ داری سے آزاد ہو گئے۔

(۴)

۳ اگست ۱۹۳۶ء کو سرور صاحب کی شادی جنم بخش صاحب قادری ساکن بدایوں کی صاحبزادی زادہ خاتون سے ہو گئی۔ جنم بخش قادری لکھ رہے تھے اور سرور صاحب کے والد پوسٹ ماسٹر۔ اس لیے بتول بیگم سرور، سرور صاحب کی والدہ تنوری فاطمہ اور خالہ طفیل فاطمہ دونوں نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ زادہ خاتون اور سرور صاحب کے یہاں تین بچے پیدا ہوئے۔ بڑے بیٹے کا نام صدیق احمد رکھا گیا۔ ان سے چھوٹے جاوید احمد اور سب سے چھوٹی بیٹی مہہ جبیں عرف ہو کھلا میں۔ صدیق احمد نے صحافت کو اپنا پیشہ بنایا اور ملازمت سے سبکدوش ہو کر سر سید نگر علی گڑھ میں مقیم ہیں۔ جاوید احمد سائیکلریست تھے جرنی میں قیام تھا وہیں انتقال ہوا۔ مہہ جبیں عرف ہو اپنے بچوں کے ساتھ دہلی میں مقیم ہیں۔ ان کے شوہر ڈاکٹر عبدالجلیل کا انتقال ہو چکا ہے۔

سرور صاحب کی ازدواجی زندگی خاصی خوشگوار تھی۔ جیسا کہ بیگم سرور نے خود اپنے انترویو میں کہا ہے کہ وہ اکثر بیگم سرور اور بچوں پر چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھا کرتے تھے۔ بیگم سرور کے ساتھ اکثر خریداری کے لیے بھی جاتے تھے۔ علی گڑھ سے باہر کسی سفر پر جاتے تو بیگم سرور کے لیے سازیاں ضرور لاتے۔ بچوں کے ساتھ کیم کھیلتے، بیت بازی میں حصہ لیتے، انھیں تاش کھیلنا سکھاتے، بچوں کو اپنے ساتھ چبیل قدی کے لیے لے جاتے اور ناراضگی کی صورت میں بچوں سے بیگم کو پیغام بھی بھیجا کرتے تھے۔

(۵)

۱۹۳۵ء میں ریاست رامپور نے دو سال کے لیے سرور صاحب کی خدمات یونیورسٹی سے مستعار لے لیں۔ رامپور میں کرنل بشیر حسین زیدی وزیر اعلیٰ اور خواجہ غلام السید یعنی مشیر تعلیم تھے۔ دونوں سرور صاحب کی صلاحیتوں کے قائل تھے۔ ۱۹۳۲ء میں ان کی ریڈیانی تقاریر کا ایک مجموعہ 'تنقیدی اشارے' کے نام سے شائع ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی

اردو، عزیز احمد کے اشتراک سے ان کا مرتب کردو اردو شاعری کا انتخاب، انتخاب جدید کے نام سے شائع کرچکی تھی۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم یونیورسٹی اسٹاف ایسوی ایشن اور دوسرے پلیٹ فارموں سے ان کی تقریروں نے لوگوں کے دل جیت رکھے تھے۔ اس پس منظر میں انہوں نے ۱۲ مارچ ۱۹۷۵ء، کورنلیا انڈر کالج رامپور کی پرنسپلی کا چارچ سنبھالا۔ لگ بھگ سوا مبینے کے بعد ہی انہوں نے کالج میں یومِ اقبال منانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس تقریب کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین اور صدارت رشید احمد صدیقی نے کی۔ نئے تعلیمی سال ۱۹۷۶ء میں وہ تعلیم بالفان کے پروگرام کے ڈائرکٹر بھی مقرر کر دیے گئے۔ اور ہر ہفتہ طلباء کے لیے ایک خاص لکچر کا اہتمام بھی کیا جانے لگا۔ یہ سلسہ ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ ترقی کے ایک اور موقع نے سرور صاحب کے دروازے پر دستک دی۔

## (۲)

اگست ۱۹۷۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے ریڈر کی حیثیت سے سرور صاحب کا تقریب میں آیا۔ ۲۱ اگست ۱۹۷۶ء کو انہوں نے اپنی خنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ علی گڑھ اور رامپور کے مقابلے میں لکھنؤ ایک بڑا شہر تھا۔ اس کے ماحول میں زیادہ کشادگی اور رنگارنگی تھی۔ یہاں سرور صاحب کی شخصیت مزید نکھری۔ وہ مختلف قسم کی شخصیتوں کے قریب پہنچ، مختلف قسم کے لوگوں کو اپنے قریب کھینچتا۔ علی گڑھ میں سرور صاحب نے ترقی پسند مصنفوں کے پہلے افسانوی مجموعے ازگارے کے خلاف سخت مضمون لکھا تھا۔ لکھنؤ میں ان کے گھر ترقی پسند مصنفوں کی انجمن کے جانے ہوئے گے۔ کافی باوس میں ان کے گرد جوانوں کا حلقہ ہونے لگا۔ اُپی اور شیر و آنی میں ملبوس رہنے والے سرور صاحب سوت میں نظر آنے لگے۔ یہاں ان کی ملاقات بھگوتی چڑن درما سے ہوئی، لیش پال سے ہوئی، امرت لال ناگر سے ہوئی، نیشنل ہیرالد کے ایڈیٹر چیلائپی راؤ سے ہوئی۔ یہیں وہ رشید جہاں اور محمود الظفر سے ملے۔ انگریزی کے استاد شیام کرشن نرائن، اکنامکس کے ویر بہادر، اور تاریخ کے کشن چند سری و استو سے تعلقات بڑھے۔ یہیں آنند نرائن ملا سے ملاقات ہوئی، مسز سروجنی نامڈو سے واقفیت ہوئی، سید احتشام حسین ان

کے دوستوں کے حلقے میں شامل ہوئے، یہیں بیگم اختر سے ملاقات ہوئی، یہیں I.A.Richards کا لکھر سننے کا موقع ملا۔ یہیں اسٹینفین اپنڈر اور لوئی میک نیس کا کلام سننے کا موقع ملا، یہیں چودھری محمد نعیم، قاضی عبدالستار، نادر علی خاں اور مسعود عالم جیسے شاگرد ملے، یہیں رضیہ سجاد ظہیر، رنجنا سدھانتا اور دیوکی پانڈے جیسی خواتین سے ملاقات ہوئی۔ شعر و ادب، علوم و فنون اور دانشوری کا ایک دریا تھا جو موجیں مار رہا تھا۔ سرور صاحب نے اس دریا کی گہرائیوں سے اپنے کام کے موئی تلاش کر لیے۔

انتظامی سطح پر ایک رسائلی بھی ہوتی رہی۔ اس وقت تک لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو اور فارسی کا مشترک شعبہ تھا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب صدر شعبہ تھے۔ سرور صاحب نے اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے چند مینے بعد ہی فیکٹری میں یہ تجویز پیش کی کہ اردو کا شعبہ فارسی سے الگ کر دیا جائے۔ اس تجویز کی مخالفت بھی ہوئی۔ لیکن تمام مخالفت کے باوجود فیکٹری اور اکیڈمک کاؤنسل میں یہ تجویز پاس ہو گئی۔ اردو کا الگ بورڈ آف اسٹڈیز بنایا گیا۔ شعبہ الگ نہیں ہوا۔ جب پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب ملازمت سے سبد و ش کچھ دنوں بعد واکس چانسلر نے ایک جو نیز ریڈر یوسف حسین موسوی کو صدر شعبہ نامزد کر دیا۔ سرور صاحب نے اس کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنا استعفی پیش کر دیا۔ ایگزیکٹیو کونسل کی میننگ میں واکس چانسلر کو اس بات کے لیے مجبور کیا گیا کہ وہ سرور صاحب کا استعفی منظور نہ کریں اور انھیں بلا کر استعفی واپس لینے کو کہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ واکس چانسلر کی اس یقین دہانی کے بعد کہ وہ یونیورسٹی کے قوانین میں جلد ہی یہ ترمیم کروادیں گے کہ پروفیسر کی غیر موجودگی میں سب سے سینٹر ریڈر ہی شعبہ کا صدر ہو گا سرور صاحب نے اپنا استعفی واپس لے لیا۔ بظاہر حالات معمول پر آگئے۔ لیکن دل میں گانجھ پڑ چکی تھی۔ ادھر قوانین کی تبدیلی میں بھی وقت لگا۔ اسی دوران ڈاکٹر ڈاکٹر حسین کے ایک دوست عطاء اللہ درانی (مقیم امریکہ) نے کلام غالب کے انگریزی ترجمہ اور نول کشور پر کتاب لکھوانے کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ایک خطیر رقم بطور عطیہ عنایت فرمائی۔ اس کام کے لیے شعبہ اردو میں سید حسین ریسرچ پروفیسر کا عہدہ قائم ہوا اور سرور صاحب کا

اس عبده پر تقرر ہو گیا۔ دس سال آنھے ماہ اور انمارہ دن کی خود عائد کردہ جلاوطنی کے بعد یہ یوسف گم گشته پھر اپنے کنعاں میں واپس لوٹ آیا۔ ۱۹۵۵ء کی دسمبر ۱۹۵۵ء کو سرور صاحب نے علی گڑھ میں پھر سے قدم رکھا اور بقول پروفیسر محمد حسن خیمه زد و بارگاہ ساخت۔

(۷)

ابتداء سے قیام لکھنؤ تک کے زمانے کو سرور صاحب کی زندگی کا اقتدار منافق Anti-establishment دور کہا جاسکتا ہے۔ دسمبر ۱۹۵۵ء میں ان کی دوبارہ علی گڑھ آمد سے ان کی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جسے ہم اقتدار کا حصہ بن جانے سے تغیر کر سکتے ہیں۔ ۱۹۵۵ء کو وہ علی گڑھ آئے، واکس چانسلر ڈاکٹر ڈاکٹر حسین کے یہاں قیام کیا اور شعبہ اردو میں اپنی ذمہ داری سنپھال لی۔ ۱۹۵۶ء کو (علی گڑھ آنے کے انمارہ دن بعد) انجمن ترقی اردو (ہند) کے اعزازی سکریٹری مقرر ہوئے۔ اسی کے ساتھ انجمن کے اخبار 'ہماری زبان' کی ادارت کی ذمہ داری بھی ان کے سر آگئی۔ ۱۹۵۰ء سے انجمن کا مجلہ 'اردو ادب' ان کی ادارت میں شائع ہو ہی رہا تھا۔ سال بھی ختم نہیں ہو پایا تھا کہ پہلی نومبر ۱۹۵۶ء سے یونیورسٹی کی سب سے قدیم اور سب سے اہم اقامت گاہ سرید بال کے پروووست (Provost) مقرر ہو گئے اور ۱۹۵۸ء تک یہ ذمہ داری نجاتے رہے۔ ۱۹۵۸ء مئی کو یعنی علی گڑھ آنے کے دو سال چار ماہ بعد شعبہ اردو کے صدر ہو گئے۔ پہلی اگست ۱۹۵۸ء سے رشید احمد صدیقی کی جگہ پر پروفیسر ہو گئے۔ اسی کے ساتھ ہے اعتبار عبده علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی ایکیم کے ڈائریکٹر بھی ہو گئے۔ اسی سال یونیورسٹی کی کمپرل کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۸ء سے وہ ساہتیہ اکیڈمی کے نمبر تھے۔ ۱۹۵۸ء میں اس کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوز اور اکیڈمی کی کوسل اور ایکزیکٹیو بورڈ کے نمبر بھی منتخب ہوئے۔ اگست ۱۹۶۰ء میں بین الاقوامی مستشرقین کانگریس میں شرکت کے لیے وزارت تعلیم، حکومت ہند کی طرف سے ماسکو بھیجے گئے۔ دسمبر ۱۹۶۰ء سے دسمبر ۱۹۶۲ء تک طلباء کے ایک اہم اقامتی ادارے آفتاب ہال کے پروووست (Provost) رہے۔ اسی دوران ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء تک وہ مسلم یونیورسٹی اسٹاف ایسوی ایشن کے صدر رہے۔ ۱۹۶۱ء میں یونیورسٹی

ایگریکیو کو نسل کے ممبر ہوئے۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۶ء تک آرٹس فیکٹی کے ڈین رہے۔ جون ۱۹۶۶ء میں بین الاقوامی ترجمہ کانفرنس میں شرکت کے لیے کابل گئے۔ اسی سال وزارت تعلیمات، حکومت ہند نے 'بھارتی بجاشا سمیت' کے نام سے ایک مشاورتی کمیٹی بنائی۔ اس کا کام جدید ہندوستانی زبانوں کی ترقی کے سلسلہ میں حکومت کو مشورے دینا تھا۔ کمیٹی کے صدر اس وقت کے وزیر تعلیم تھے۔ ہر ریاست سے ایک ایک نمائندہ کے علاوہ آٹھویں شیڈول میں درج تمام زبانوں کے ایک ایک ادبی بھی مقرر کیے گئے۔ اسی کمیٹی میں اردو کی نمائندگی کے لیے سرور صاحب کا انتخاب کیا گیا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۹ء کو شکا گو یونیورسٹی، امریکہ کی دعوت پر وزینگ پروفیسر کی حیثیت سے شکا گو گئے۔ وہاں کے دوران قیام و سکان، منوسوں، بارور ڈ اور فلاڈیفیا کی یونیورسٹیوں میں مختلف موضوعات پر لکھر دیے۔ مارچ ۱۹۷۰ء کے آخر میں عبدالرحمن بارکر کی دعوت پر اسلام اسٹڈیز انٹرنسی نیوٹ مانزیل میں سرپید پر لکھر دیا۔ ۲۸ اپریل ۱۹۷۰ء کو جرمنی ہوتے ہوئے اپنے وطن واپس آئے۔ ۱۹۷۲ء میں ثقافتی لین دین کے پروگرام کے تحت رومانی، ہنگری اور سوویت یونین کا سفر کیا۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو ان کی مدت ملازمت ختم ہو رہی تھی۔ انھیں ایک سال کی توسعی دی گئی۔ اس طرح وہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر اور صدر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انھوں نے اپنا پورا وقت انہم ترقی اردو کے کاموں میں لگا دیا۔ اسی سال مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ننی دہلی نے ان کے مضمایں کا ایک مجموعہ 'نظر اور نظریہ' کے نام سے شائع کیا۔ جلد ہی انھیں انٹرنسی نیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز شملہ میں وزینگ فیلو کی حیثیت سے بلا لیا گیا۔

(۸)

کم اپریل ۱۹۷۴ء سے اوخر ۱۹۷۶ء تک سرور صاحب انٹرنسی نیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز شملہ میں وزینگ فیلو کی حیثیت سے مقیم رہے۔ یہاں انھیں رامپور، لکھنؤ اور علی گڑھ تینوں جگہوں سے مختلف ماحول ملا۔ یہاں تدریسی مصروفیت نام کی کوئی چیز نہ تھی، انتظامی مسائل بھی نہیں تھے۔ یونیورسٹیوں کی پھیلی ہوئی دنیا کے برکس یہ ایک چھوٹی سی دنیا تھی۔

تمام بہنگاموں سے دور، فطرت کی گود میں، چاروں طرف سے فرحت بخش منظر میں گھرا ہوا یہ مرکز کبھی واس ریگل لاج ہوا کرتا تھا۔ ملک کی آزادی کے بعد گرمی کے موسم کے لیے صدر جمہوریہ ہند کی قیام گاہ بنا۔ رادھا کرشمن کے زمانہ میں اس واس ریگل لاج کو ایک علمی تحقیق کے مرکز میں تبدیل کر دیا گیا۔ اب یہاں مختلف علوم و فنون اور زبان و ادب کے ماہرین جمع ہوتے اور اپنی تحقیقات سے دنیا کو مستفید کرتے ہیں۔ اس وقت اس ادارہ کی لاہوری میں ذیزد لاکھ سے زیادہ کتابیں موجود ہیں اور لگ بھگ سائز ہے پانچ سو رسائل و جرائد یہاں مستغلِ منگائے جاتے ہیں۔ ۱۹۹۱ء سے اس ادارہ نے بشریات اور سماجی علوم کے انٹریونیورسٹی مرکز کے طور پر بھی کام کرنا شروع کیا ہے۔ یہاں سرور صاحب کی شخصیت، ذہن و فکر اور مطالعہ میں مزید وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی۔ یہاں بشریات کے عالم سچا ش ملک، فلسفہ کے پروفیسر دیاشنکر اور چید اندن مورثی، تاریخ کے نہار رنجن رائے، سدھیر چند اور بی بی مصراء، انگریزی کے کے اے ایس آئینگر اور نر سمبھاراؤ، ہندوستانی آرت کے کپیلا و اتسان، ہندی کے ہری بنس بچن، پر بھا کر ماچوے، نرمل درما اور و اتسان، بہگالی کے سر کمار گھوش، نامس آف انڈیا کے ایڈیٹر گرمی لال جین، ساہتیہ اکادمی کے سابق سکریٹری کرشاکر پالی، کنز شاعر اڑیگا، مراثی شاعر ریگے، کنز کے ناول نگار آشت مورثی، پنجابی کے ادیب عطر سنگھ، بہگالی شاعر بدھ دیوبوس، بہگلہ ادیب آنند شنکرے، غیرہ سے ان کی ملاقاتیں رہیں۔ ہر ہفتے کوئی نہ کوئی فیلو اپنے مضمون پر مقابہ پڑھتا اور اس پر بحثیں ہوتیں۔ سال میں تین چار سمینار ہوتے جن میں مختلف میدانوں کے ماہرین شرکت کرتے۔ انسٹی ٹیوٹ میں اپنے قیام کے دوران ہونے والے دو سمیناروں کا سرور صاحب نے خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک سمینار کا موضوع فلسفہ میں انسان کا تصور اور دوسرے کا موضوع ادب میں انسان کا تصور تھا۔ دوسرے سمینار کے کنویز سرور صاحب ہی تھے۔ یہیں کے دوران قیام ۱۹۷۸ء میں مکتبہ جامعہ لمبیڈ، ننی دبلی نے ان کی کتاب 'مررت سے بصیرت تک' شائع کی اور اسی سال انھیں ساہتیہ اکیڈمی انعام سے بھی نوازا گیا۔ یہیں کے دوران قیام انھیں جموں یونیورسٹی اور کشمیر یونیورسٹی دونوں جگہوں سے آفر آئے۔ سرور صاحب نے کشمیر یونیورسٹی کو ترجیح دی۔ اور ۲۱ مئی ۱۹۷۸ء کو اقبال چیئر کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔

(۹)

کشمیر سے سرور صاحب کا تعلق بہت پرانا تھا۔ طالب علمی کے زمانہ سے ہی وہ کشمیر کے حسن کے عاشق تھے۔ ۱۹۳۳ء اور ۱۹۴۰ء میں اپنے بعض دوستوں کے ساتھ وہ کشمیر کا خاصاً مبارکہ سفر کر چکے تھے۔ کشمیر کی بعض اہم شخصیتوں بے شمول شیخ عبداللہ سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ اقبال سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کی وجہ سے شیخ عبداللہ انھیں عزیز رکھتے تھے۔ چنانچہ اقبال چیز کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی سرور صاحب نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ۲۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو انہوں نے اقبال کے مطالعے کے تناظرات کے عنوان سے افتتاحی خطبہ دیا جو ۱۹۷۸ء میں کشمیر یونیورسٹی سے شائع ہوا۔ اس خطبہ میں انہوں نے اقبال چیز کے قیام پر کشمیر یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کو مبارک باد دیتے ہوئے اس پیش کش کو قبول کرنے کی وجہ بھی بیان کی۔ انہوں نے کہا:

”میں نے کشمیر یونیورسٹی کی یہ پیش کش اس وجہ سے قبول نہیں کی کہ صرف ادب کا مطالعہ اور اس کی افہام و تفہیم ہی میرا پیشہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال کی شاعری سے مجھے ابتداء سے بہت گہری دلچسپی رہی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے مشق بھی کہہ سکتے ہیں۔“

اقبال کی عظمت کے مختلف پہلوؤں اور مطالعہ کے مختلف تناظرات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ:

”سب سے پہلی ضرورت اقبال کی زندگی اور شخصیت پر نہ سرے سے نظر گرنے کی ہے۔ ہماری مشرقیت اپنے مشاہیر کی خوبیوں اور بڑائیوں پر ہی دھیان دیتی ہے۔ اس معروضی نظر کی قائل نہیں جس میں سارے حقائق کا جائزہ لیا جائے اور ہر خوبی اور ہر خامی کا تجزیہ کیا جائے۔ اقبال کی شخصیت کی پوری تصویر ابھی سامنے نہیں آئی۔ اقبال کی شخصیت کے متعلق سارے بکھرے ہوئے اشارے جمع کیے جائیں اور انھیں جدید نظریات کی روشنی میں دیکھا جائے جس طرح ایکر ک ایکر سن نے Gandhi's Truth میں گاندھی جی کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔ تو اس سے اقبال کی عظمت بڑھے گی۔ مجھے گی نہیں۔ وہ انسان کی

حیثیت سے ہم سے قریب نظر آئیں گے اور ان کے فن کو سمجھنے میں ہمیں مدعا ملے گی۔<sup>۱۰۵</sup>

۲ "اقبال کی ادبی روایت کی روشنی میں ان کے تجربات کی معنویت تاثر کی جائے۔ نظموں کے تفصیلی مطالعہ کے بعد ہی ان کے فن، جمالیاتی شعور اور فنون اطیفہ کے متعلق ان کے نظریات کا جائزہ منسیہ ہو گا۔"<sup>۱۰۶</sup>

۳ "اقبال کے ہم عصر دیں میں بیگور اور آرہندو کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان تینوں کے یہاں سرد عقلیت اور اندھی مفریبیت کے خلاف بغاوت ملتی ہے۔ ان تینوں کا موازنہ اقبال کو ہم عصر ہندوستان کے ہنچی میلانات اور عالمی اثرات کے تناظر میں پیش کر کے ہوئے ذکاروں اور دانشوروں کی مشاہدت اور فرق کو واضح کر سکتا ہے۔"<sup>۱۰۷</sup>

۴ "اقبال کا تصوف سے رشتہ اسی طرح کا ہے جیسا رابرٹ فراست کا زندگی سے۔ یعنی یہ ایک پریمی کا جھگڑا ہے۔ اقبال تصوف کے فلسفہ کے منافی ہیں مگر وہ تصوف کے مزاج، اس کی انسان دوستی، اس کی رواداری کے قائل ہیں۔ اقبال اور تصوف کا مطالعہ اس روشنی میں یقیناً منسیہ ہو گا تاکہ فقر اور مزاج خانقاہی میں جو فرق ہے اس کا عرفان عام ہو۔"<sup>۱۰۸</sup>

۵ "اقبال کی تصانیف میں احتجاد کے مسئلے کی مرکزی اہمیت ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں شاہ ولی اللہ نے سب سے پہلے اس کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی۔ سرسید اور مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں بھی اس مسئلے پر اظہار خیال ملتا ہے۔ سرسید اور آزاد دونوں سے زیادہ اقبال کی نظر اسلامی علوم، قوانین اور نئی زندگی کے مسائل پر تھی۔ اس لیے اس مسئلے کا جائزہ نہ صرف اقبالیات کے سلسلے میں اہم ہے بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی میں بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔"<sup>۱۰۹</sup>

۶ "سوشلم کے متعلق اقبال کے خیالات کا جائزہ اس لیے آج اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ اب سوشلم کا ایک روپ نہیں ہے۔ روں، چین، یوگوسلامیہ میں الگ الگ روپ ملتے ہیں۔ ہندوستان اپنے راستے سے سوشلم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اقبال سرمایہ داری کے خلاف ہیں اور سوشلم کے علمبردار۔ سوال یہ ہے

کہ کیا ان کا سو شلزم جو اسلام پر مبنی ہے اس سو شلزم کی طرف ہنماں کرتا ہے جس کے انسانی چہرے پر اب اصرار کیا جا رہا ہے۔۔۔

ظاہر ہے اتنے وسیع تناظر میں اقبال کا مطابعہ اقبال چیز کے محدود دائرے میں ممکن نہ تھا۔ اس لیے سرور صاحب نے شروع سے ہی اقبال چیز کو اقبال انسٹی یوت میں تبدیل کرنے کا پروگرام بنایا۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں انہوں نے اقبال اور تصوف کے موضوع پر سمینار منعقد کیا۔ دسمبر ۱۹۷۷ء میں انہوں نے بین الاقوامی اقبال کانگریس، لاہور میں شرکت کی۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں 'اقبال اور مغرب' کے موضوع پر سمینار منعقد کیا گیا۔ یہ اور بعض دوسرے عوامل نے مل کر اس بات کے لیے راہ ہموار کی کہ سرور صاحب کا اقبال انسٹی یوت کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے۔ ۱۹۷۹ء کے آغاز میں اقبال انسٹی یوت قائم ہو گیا۔ سرور صاحب اس کے پہلے فاؤنڈر ڈائیکٹر متقرر ہوئے۔ ایک لکھرر، ایک ریڈر اور ایک فیلو کی پوسٹ اور ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے ریسرچ کرانے کی اجازت بھی مل گئی۔ لکھرر کی جگہ پر ایمن اندرابی اور ریڈر کی جگہ پر ڈائیکٹر بیگر احمد جائی کا تقرر ہوا۔

یہ اہتمام کیا گیا کہ ہر سال اقبال پر ایک سمینار ضرور ہو، لیکن اس کے علاوہ اور دوسرے متعلقہ موضوعات پر مذاکرہ کے دروازے بھی بند نہیں کیے گئے۔ چنانچہ سرور صاحب کی ڈائیکٹر شپ کے زمانہ میں ایک درجن سے زیادہ موضوعات پر سمینار ہوئے۔ ان سمیناروں میں اقبال اور گوئئے، اقبال اور تصوف، اقبال اور مغرب اور اقبال کی سیاسی فکر وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ان سمیناروں کے علاوہ سرور صاحب نے تو سیمی خطبات کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ ان خطبات میں فلسفہ اور شاعری پر پروفیسر دیا کرشن (راجستان یونیورسٹی)، اقبال کے ترجمہ کے مسائل پر خشونت سنگھ، مولانا روم پر امامیری شمل، اور اسلام اور قومیت کے مسئلے پر پروفیسر مشیر الحسن کے خطبے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان خطبوں اور سمیناروں کے مقالوں میں سے اکثر کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ سرور صاحب نے انسٹی یوت سے 'اقباليات' نام کا ایک مجلہ بھی نکالنا شروع کیا۔ اس مجلہ کے صرف دو شمارے سرور صاحب کی ادارت میں شائع ہو سکے۔ وہاں کے دوران قیام سرور صاحب کا

ایک بڑا کارنامہ وہاں ایک ایسی لاہوری می کا قیام بھی ہے جس میں دنیا بھر میں اقبال پر لکھی گئی کتابوں کا بڑا حصہ جمع کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تصوف اور علوم اسلامیہ کا بھی بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ یہی حال یہاں کے وزینگ فیلو کا بھی رہا۔ پروفیسر عالم خوند میری، پروفیسر مسعود حسین خاں اور پروفیسر سید سراج الدین جیسی متاز شخصیتیں وزینگ فیلو کی حیثیت سے انسٹی یوت میں تشریف لائیں۔ ان کاموں کے علاوہ لگ بھگ ایک درجن اسکالریں نے اس ادارہ سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ذمہ داریاں حاصل کیں۔ انسٹی یوت کے کاموں میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ہر سال ۲۱ اپریل کو یوم اقبال کے موقع پر سری نگر کے مختلف کالجوں میں مضمون نویسی، بیت بازی اور مباحثوں کا انعقاد کیا جائے تاکہ اندر گریجویٹ طلباء کی تربیت کی جاسکے۔ ۷۷، ۱۹۸۷ء سے ۷۸، ۱۹۸۸ء تک لگ بھگ دس سال سرور صاحب سری نگر میں رہے۔ پہلے اقبال پروفیسر، پھر اقبال انسٹی یوت کے ڈائزیکٹ اور کئی بار کشمیر یونیورسٹی کے ہارگزار واکس چانسلر کے فرائض بھی انجام دیے۔ باآخر اکتوبر ۷۸، ۱۹۸۷ء میں اپنی گرتی ہوئی صحت کی وجہ سے وہ علی گڑھ واپس آگئے۔ سری نگر کے دوران قیام ہی ۷۸، ۱۹۸۷ء میں لاہور سے ان کی دو کتابیں 'اقبال اور ان کا فلسفہ' اور 'عرفان اقبال' شائع ہوئیں۔ ۷۹، ۱۹۸۷ء میں دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے ان کا خطبہ 'اقبال نظریہ اور شاعری' منظر عام پر آیا۔ ۸۰، ۱۹۸۷ء میں زہرا معین نے ان کی مختلف تحریروں کے اقتباسات کی مدد سے ان کی ایک سوانح تیار کر کے 'حرف سروز' کے نام سے شائع کی۔ اسی سال خوبجہ غلام السید دین میموریل نرسٹ دہلی کی دعوت پر انہوں نے 'ہندوستان کدھر' کے عنوان سے ایک خطبہ دیا جو ۸۳، ۱۹۸۷ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ ۸۲، ۱۹۸۷ء میں غالب انسٹی یوت دہلی نے انھیں غالب مودی انعام سے نوازا۔ ۸۵، ۱۹۸۷ء میں شمس الرحمن فاروقی نے ان کے اعزاز میں 'تحفۃ السروز' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جسے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ننی دہلی نے شائع کیا۔ اسی دوران ۸۷، ۱۹۸۷ء میں حکومت ہند کے وزارت تعلیم کے ذریعہ قائم ترقی اردو بورڈ کے نائب چیئر میں مقرر ہوئے۔ اسی حیثیت سے اردو زبان کے فروع اور ترقی کے لیے مشورے دینے والی گجرال کمیٹی کی رپورٹ پر تبصرہ کرنے کے لیے بنائی گئی کمیٹی کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ یہ کمیٹی بعد میں 'سرور کمیٹی' کے نام سے مشہور ہوئی۔

(۱۰)

۱۹۳۶ء میں سرور صاحب نے علی گڑھ میں ایک زمین خرید لی تھی۔ ۱۹۷۵ء میں انہوں نے اس پر ایک مکان بنوا لیا۔ اب یہ علاقہ سریڈنگر کے نام سے جانا جاتا ہے اور ان کی زمین کے باقیہ خالی حصہ پر ایک عمارت ساز نے ان کے نام سے 'سرور اپارٹمنٹ' بنا دیا ہے۔

علی گڑھ والپی کے بعد سرور صاحب نے اپنے پارہ ہائے لخت کو جمع کرنا شروع کیا۔ خودنوشت لکھی، شعری مجموعہ مرتب کیا، مضمایں اور دیگر تحریروں کے مجموعے مرتب کیے۔ نتیجہ کے طور پر ان کی درج ذیل کتابیں شائع ہوئیں:

- |    |   |
|----|---|
| ۱  | ہندوستانی مسلمان اور مجیب صاحب (خطبہ) ۱۹۸۹ء |
| ۲  | خواب باقی ہیں (آپ بنتی) ۱۹۹۱ء               |
| ۳  | خواب اور خلش (شعری مجموعہ) ۱۹۹۱ء            |
| ۴  | بیچان اور پرکھ (تنقیدی مضمایں) ۱۹۹۱ء        |
| ۵  | دانشور اقبال (تنقیدی مضمایں) ۱۹۹۲ء          |
| ۶  | فکر روشن (تنقیدی مضمایں) ۱۹۹۲ء              |
| ۷  | کچھ خطبے کچھ مقالے (تنقیدی مضمایں) ۱۹۹۲ء    |
| ۸  | رشید احمد صدیقی کے خطوط ۱۹۹۶ء               |
| ۹  | خطوط عبدالحق بنام آل احمد سرور ۱۹۹۸ء        |
| ۱۰ | اردو تحریک (اداریے) ۱۹۹۹ء                   |
| ۱۱ | افکار کے دیے (متفرقہ) ۲۰۰۰ء                 |

اسی دوران ڈاکٹر معین الرحمن نے اپنے ادارے 'الوقار' سے سرور صاحب کے ابتدائی پانچ مجموعہ مضمایں کو ایک ساتھ جمع کر کے ۱۹۹۲ء میں 'مجموعہ تنقیدات' کے نام سے شائع کر دیا۔ ۱۹۸۹ء میں کشمیر یونیورسٹی نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ ۱۹۹۵ء میں شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے

انجیس پروفیسر ایم ریٹس کے عہدہ جلیلہ پر فائز کیا۔ ۱۹۹۲ء میں حکومت ہند نے انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے نواز۔ ۲۰۰۰ء میں ان کی خودنوشت 'خواب باقی ہیں' کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ ۲۰۰۱ء میں 'اقبال سماں' سے نوازے گئے۔ اسی سال ۲۲، ۲۵، ۲۵ رفروری کوشuben اردو علی گزہ مسلم یونیورسٹی میں ان پر دو روزہ سمینار منعقد ہوا جس میں مقتند رشناختیوں نے سرور صاحب کی زندگی میں ہی نہیں ان کی موجودگی میں ان پر مقابلے پڑھے۔ بعد میں ان مفتاضیوں کا مجموعہ ارمغان سروز کے نام سے مرتب کر کے ان کے شاگرد پروفیسر اصغر عباس نے انہیں ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی سے شائع کیا۔ اس سمینار میں پہلی مرتبہ سرور صاحب مخصوص نظر آئے۔ ۱۹۹۶ء میں ان پر فائی کا حملہ ہو چکا تھا۔ ۱۹۹۷ء میں وہ اپنے بیٹے جاوید احمد صدیقی کی موت کا صدمہ برداشت کر چکے تھے۔ پھر بھی وہ زندگی کی گاڑی کو کھینچ رہے تھے۔ اس حالت میں بھی جب وہ خود نہیں پڑھ سکتے تھے دوسروں سے اخبارات و رسائل اور کتابیں پڑھوا کر سنتے تھے۔ روزنامہ 'سیاست' حیدر آباد کے لیے کچھ دنوں پندرہ روزہ کالم بھی املا کرتے رہے۔ خطوط کے جواب وہ آخر وقت تک پابندی سے دیتے تھے۔ لیکن ۲۰۰۲ء کی ابتدائی تاریخوں میں ان کے داماد ڈاکٹر عبدالجلیل کی موت نے انھیں بالکل توڑ کر رکھ دیا۔ بدقت تمام وہ بیٹی کے غم میں شرکت کے لیے دہلی گئے۔ اور پھر واپس زندہ نہ آسکے۔ وہیں ۸ اور ۹ رفروری ۲۰۰۲ء کی درمیانی شب میں ان کا انتقال ہو گیا۔ جنازہ ۹ رفروری ۲۰۰۲ء کو علی گزہ لا یا گیا جہاں وہ یونیورسٹی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

## حوالے

- ۱ اقبال کے مطالعے کے تناظرات، آل احمد سرور، کشمیر یونیورسٹی، سرمی نگر ۸۷-۱۹، ص ۲
- ۲ اقبال کے مطالعے کے تناظرات، آل احمد سرور، کشمیر یونیورسٹی، سرمی نگر ۸۷-۱۹، ص ۲۸-۲۹
- ۳ اقبال کے مطالعے کے تناظرات، آل احمد سرور، کشمیر یونیورسٹی، سرمی نگر ۸۷-۱۹، ص ۲۹
- ۴ اقبال کے مطالعے کے تناظرات، آل احمد سرور، کشمیر یونیورسٹی، سرمی نگر ۸۷-۱۹، ص ۲۹
- ۵ اقبال کے مطالعے کے تناظرات، آل احمد سرور، کشمیر یونیورسٹی، سرمی نگر ۸۷-۱۹، ص ۳۰
- ۶ اقبال کے مطالعے کے تناظرات، آل احمد سرور، کشمیر یونیورسٹی، سرمی نگر ۸۷-۱۹، ص ۳۰
- ۷ اقبال کے مطالعے کے تناظرات، آل احمد سرور، کشمیر یونیورسٹی، سرمی نگر ۸۷-۱۹، ص ۳۰-۳۱

## شخصیت

آل حمد سرور، اپنے گھر میں علو میاں لے کھلاتے تھے۔ وہ شروع سے ایک رومانی شخصیت کے مالک تھے۔ بہت ممکن ہے ان کو سرو قد ان گوکل کی طرح خوش قد نہ کھا جاسکتا ہو لیکن ان کی شخصیت کی قد آوری سے کے انکار ہو سکتا ہے۔؟

”اپنی نشر کی طرح خوبصورت“، ”آل احمد سرور کو اگر خوش قد نہیں تو کوتا، قد بھی نہیں کھا جاسکتا تھا۔ بقول پروفیسر نور الحسن صاحب نقوی:

”رنگ گوارا، بد ان چھریرا، قد لمبا ن پست“

”ہر لباس، ہر رنگ بد ان پر بچتا۔ شیخید سے زیادہ بکے بلکے رنگِ موسمی مناسبت سے شیردانی اور سوت۔ عام لباس پتوان اور بخش شرت، گھر میں شیخیدِ معلم کا کرتا اور لختے کا پاجامہ۔ سڑیوں کے موسم میں گرم شال۔“

”چائے اور چائے سے زیادہ کافی۔ کم خوارک۔ مگر لذیدہ اور نہیں کھانے۔ پسند۔ پائے، کھاب، کریلے۔ رسائل اور فیرنی بھی پسند کھانے کو بہت زیادہ اہمیت نہیں۔ پسند کی کوئی کتاب مل گئی تو دن رات اس میں کھوئے۔ کھانا پینا سب بھول جائیں گے۔ جو کچھو سامنے آگیا کھالیا۔ نہک کم ہے یا زیادہ، کھانا تھنڈا ہے یا گرم، اس کا بھی پتہ نہیں، یہ بھی بھول کر کھانا کھایا کر نہیں۔“

ان کی زندگی زیادہ مرتب و منظم ن تھی۔ انہیں کے الفاظ میں:

”میری زندگی منظم و مرتب نہیں ہے۔ مجھ میں کوئی ایسی امنگ نہیں جو ہر دم مجھے دنیا میں آگے ہڑھنے اور نئی سیر حیاں چڑھنے پر اکسائے۔ یکسوئی سے اور باقاعدگی سے کام کرنا بھی میرے لیے آسان نہیں۔“

ایک دوسری جگہ انہوں نے لکھا ہے:

”میری زندگی میں کوئی نظم و ضبط نہیں ہے۔ باں ایک آزاد رو ضرور ہے۔ جب

سے ہوش سنبھالا کسی کتاب، کسی جلوے، کسی منظر، کسی گیفت نے متاثر کیا تو  
پکھو دیر کے لیے اسی کا ہو رہا۔<sup>۱۵</sup>

سرور صاحب کو بھی اپنے آپ میں اور کبھی کتابوں میں کھو جانے کی عادت تھی۔ اسی  
کھو جانے کے نتیجے میں ایک مرتبہ جرمنی سے اٹلی جانے کی تاریخ ان کے ذہن سے نکل  
گئی۔ جب تاریخ یاد آئی تو وقت نکل چکا تھا۔ وہ اکثر پڑھتے پڑھتے کھو جاتے۔ ایسے میں  
بیگم سرور کی آواز اکثر انھیں اس دنیا سے نکالتی تھی۔ حق تو یہ ہے کہ پوری زندگی بیگم سرور  
ان کی بہترین منتظم رہیں۔ اگر سرور کھانا کھاؤ، سرور ناشتہ کرلو یا سرور چائے نہنڈی ہو رہی  
ہے جیسے جملوں کے ذریعے وہ ان کو عملی دنیا میں واپس نہیں لے آیا کرتیں تو سرور صاحب  
کو کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ بقول بیگم سرور:

"میں اس پر بھی ناراض ہوتی تھی کہ وقت پر کھانا کھالیں۔ لیکن وہ اس کا خیال  
نہیں رکھتے تھے۔ دوست احباب کے ساتھ باتوں میں الجھ گئے تو کھانا پینا بھی  
بھول گئے۔ چار چار گھنٹے بینچ کر باتمیں کر رہے ہیں۔ دوستوں کے آنے کا کوئی  
وقت نہیں تھا۔ کوئی آنحضرت بجے آرہا ہے کوئی نوبجے اور کوئی ایک بجے۔ کھانا میز پر  
اگا ہوا ہے اور یہ بینچے باتمیں کر رہے ہیں۔ اس سے میرا مودہ آف ہو جاتا  
تھا۔"<sup>۱۶</sup>

احباب کی ان ہی محفلوں میں سرور صاحب کی گل افشاری گفتار کے نمونے سامنے  
آتے تھے لیکن ایسا بھی ہوتا تھا کہ اپنی مصروفیت کے اوقات میں سرور صاحب آنے والوں  
کو شعبہ میں ملنے کے لیے کہہ دیتے یا نہ ہونے کا بہانہ کر دیتے۔ اس سلسلہ میں لکھنؤ کے  
دوران قیام ایک بہت دلچسپ واقعہ ہوا۔ سرور صاحب نے کسی مصروفیت کی وجہ سے گھر  
کے اندر موجود ہوتے ہوئے ایک صاحب کو کھلوا دیا کہ وہ نہیں ہیں۔ ان صاحب نے کرسی  
باہر نکالی اور بینچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد پانی اور پھر چائے بھی آگئی۔ لیکن وہ لش سے مس نہیں  
ہوئے۔ کئی گھنٹے گذر گئے۔ سرور صاحب نہ گھر کے اندر رہ سکتے تھے نہ باہر جاسکتے تھے۔  
مجبوڑا کئی گھنٹے بعد دیوار کو دکر وہ پڑوس کے ایک صاحب کے گھر گئے اور وہاں سے اس  
طرح اپنے گھر میں داخل ہوئے جیسے ابھی ابھی باہر سے آرہے ہوں۔ لیکن امتحان کے ان  
لحاظات کے علاوہ سرور صاحب اکثر آنے والوں سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب

ہو جاتے تھے۔ شاید یہ اداے خاص انہوں نے رشید احمد صدیقی سے کیجی ہو جن کا ملازم سکندر اکثر آنے والوں کو باہر ہی سے یہ کہہ کر رخصت کر دیتا تھا کہ رشید صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ لیکن جب سرور صاحب دوستوں کی محفل میں ہوتے تو ایک اچھے ثابت ہوتے۔ وہ دوسروں کی سنتے بھی اور اپنی ساتے بھی۔ کبھی دوسروں پر اپنی علمیت کا رعب جمانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ پروفیسر صدیق الرحمن قدوالی نے تحریک لکھا ہے:

”ان کی علمی اور ادبی گفتگو بھی اوق اور بور کر دینے والی نہیں ہوتی تھی۔ جیسی کہ بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کی ہوتی ہے۔ ان کی باتوں کا بیشہ ایک خوشنوار اثر ہوتا تھا۔ اسی لیے ان کے پاس بیٹھنے میں بھی ایک اطف تھا۔ یہاری اور ضعف کا کوئی اثر ان کی شخصیت پر نہیں تھا۔ اپنی عمر کا احساس تو یقیناً تھا مگر جب ان کا مزاج پوچھا تو انہوں نے اپنے ایک دوست کا فقرہ دہرا دیا۔“

Things could have been worse.

یہ مزاج تھا جس کے سبب انہوں نے اپنے اردو گرد ایک خوشنوار ماحول قائم کر رکھا تھا۔ علی گزہ کے ایک سمینار میں ان سے سوال کیا گیا کہ آپ کی تنقید کی زبان اتنی آرستہ کیوں ہے؟ آپ کو بات زیادہ انہوں اور دواؤک انداز میں کہنا چاہیے۔ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

آپ کا مطلب ہے میں خود کشی کروں۔۔۔

زندگی سے یہی دلچسپی ان کی شخصیت، شاعری اور تنقید ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ زندگی سے یہی دلچسپی اور پیار قوت حیات کی صورت میں انھیں یہوی بچوں سے پیار، اس دنیا سے پیار، اس کے مسائل سے پیار اور اس زندگی کو خوبصورت بنانے، خوبصورتی سے اطف اندوز ہونے، حسن فطرت اور حسن نسوانی دونوں سے حظ اٹھانے، ادب سے مرت اور بصیرت حاصل کرنے، یہوی بچوں کی چھوٹی چھوٹی حرکتوں پر نظمیں لکھنے اور تنقید میں بھی خوبصورت نظر استعمال کرنے کی طرف انھیں مائل کرتا ہے۔

بیگم سرور نے اپنے انڑو یو میں گھر کے اس خوشنوار ماحول کا ذکر کیا ہے جس میں سرور صاحب بچوں کے ساتھ بیت بازی میں حصہ لیتے، کیرم کھلتے، انھیں تاش کھینا سکھاتے

اور اپنے ساتھ چہل قدمی کے لیے لے جاتے تھے۔ پروفیسر محمد حسن نے بیگم سرور کے ساتھ ان کی چہل قدمی اور بیگم صاحب کو پرداہ نہ کرانے کے مسئلہ کو سرور صاحب کے جدید ہونے کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔ سرور صاحب کی شخصیت میں چوں بخلوت میں روند آس کار دیگری کنند والا پہلو نہیں تھا۔ اس لیے مزاج کی یہ خوشگواری اندر باہر ہر جگہ برقرار رہتی تھی۔ پروفیسر حامدی کاشمیری نے اس سلسلہ میں خاص طور سے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جس سے سرور صاحب کے مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

”پروگرام (دور درشن سری نگر کے پروگرام دھنک) کی ریکارڈنگ کے دن سرور صاحب موڑ میں ہوتے اور بنسی مذاق، خوش گپیوں اور بذله بخی میں دلچسپی لیتے۔ یہ دن گویا ان کی تفریح کا دن ہوتا۔ ہر ایک کے ساتھ بنسی مذاق کرتے، اور مجھے کسی نہ کسی مذاق کا نشانہ بنانے سے نہ چوکتے۔ نیلی دیرش پر کسی جانی پہچانی آرٹس سے ملاقات ہوتی تو ضرور کہتے حامدی صاحب کو تو آپ جانتی ہی ہوں گی، مہوشان شہر میں کون نہیں جانتا۔ اور نہیں دیتے۔ ایک روز ایک نیلی دیرش پر وہ یوسر ایک پروگرام کے سلسلہ میں ہمیں گاڑی لے کر لینے آئی۔ میں سرور صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ جوں ہی کمرے میں داخل ہوئی سرور صاحب نے دیکھے بغیر یہ سوچ کر کہ وہ وہی پروڈیوسر ہیں جو ہم سے بعض پچھلے پروگرام کروا چکی تھیں بااتا مل کہا۔ ”بھی اچھا ہوا آپ آگئیں حامدی صاحب آپ کے لیے بے قرار ہو رہے تھے۔ ”میری حالت غیر ہو رہی تھی کیونکہ یہ وہ خاتون نہیں تھیں جن سے ہم بنسی مذاق کرتے تھے۔ میں نے معاملہ کی نزاکت کو بھانپ کر فوراً کہا ”سرور صاحب یہ وہ پروڈیوسر نہیں ہیں دوسری خاتون ہیں۔“ ”کیا فرق پڑتا ہے بھی! یہ بھی آپ کی فیں ضرور ہوں گی۔“ سرور صاحب مسکراتے ہوئے پورے اطمینان سے بولے اور نہیں دیے۔<sup>۵۰</sup>

سرور صاحب کو پہاڑوں سے عشق تھا۔ وہ بار بار فطرت کے حسین مناظر کی تماش بلکہ اپنے آپ کو فطرت میں گم کر دینے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے خود لکھا ہے کہ:

”پہاڑوں سے مجھے عشق ہے... میرے لیے پہاڑوں میں زیادہ کشش ہے۔ مجھے ان کی آغوش میں سکون ملتا ہے۔ طبیعت کو ایک شادابی حاصل ہوتی ہے۔

برف پوش چونیوں کا انکارہ روح کو پرواز پر مل کرتا ہے۔ چنانوال سے ہو گر تیز اور پر شور موجود کا سکرنا، سمندا، پھیندا اور آگے بڑھنا وجد میں لاتا ہے۔ اُندر ندی پر شور نہیں ہے بلکہ ایک شیریں نغمہ کے ساتھ ترل ترل بہرہی ہے تو، ڈیور تھہ کا یہ مصرع یاد آتا ہے Beauty Born of Murmuring Sound دیوار کے جھنڈ کے جھنڈ کہہ رہے ہیں کہ ہماری طرح تم بھی آسمان سے باتمیں کرو۔ دریا کے کنارے دور تک خود روپھول رنگ اور خوبیو پھیلاتے ہیں۔ یہ انکارے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ جسم اور روح دونوں نے غسل کیا ہے۔ ذہن سے سارا رنگ دور ہو جاتا ہے۔ فطرت کا یہ حسن، زندگی کا ایک نیا عرفان عطا کرتا ہے۔ فطرت کی آنکھ میں دم لے کر ہم پھر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ پہنچا، پہنچا، پہنچا، واڑی، شیش ناگ، گلزار ناگ، اچھا بل، گھرگ، گھلن مرگ، گنگن، سونہ مرگ، بالل، زوجی لا، مٹائیں، میری روح میں آج بھی بے ہوئے ہیں۔<sup>۹</sup>

سرور صاحب کا خط خاصاً خراب تھا۔ اسے پڑھ پانا ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کے شاگردوں میں پروفیسر شہریار، پروفیسر کبیر احمد جائسی اور پروفیسر اصغر عباس نے ان کی خاصی تحریریں صاف کی تھیں۔ اس لیے ان لوگوں کو خاص طور سے ان کی تحریر پڑھنے میں آسانی ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ محمود ایاز (مدیر رسالہ 'سونگات' بنگور) نے لکھا تھا کہ میں سرور صاحب کی تحریریں اندازے سے پڑھ لیتا ہوں۔ سرور صاحب نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے:

"میرا خط پہلے ہی اچھا نہ تھا۔ اب کچھ اور جتنا ہو گیا ہے۔ موافق عبد الحق نے ایک دفعہ میرا ایک مضمون دیکھ کر کہا تھا کہ آپ کی تحریر پڑھنے کے لیے صرف اردو رسم خط سے واقفیت کافی نہیں۔ کچھ ذہانت کی بھی ضرورت ہے۔ میں ان لوگوں پر رٹک کرتا ہوں جو صاف اور خوش خط لکھتے ہیں... دراصل میری طبیعت میں صہرنہیں ہے۔ خوش خطی کی مشق مجھے بھی مکتب میں کراچی گئی تھی۔ مگر میری جلد بازی کی وجہ سے یہ رایگاں گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ صاف اور قدرے جلی تحریر لکھنے والے کی سیرت کی کشاوی کی دلیل ہے اور باریک عبارت اور بدخطی ذہن کی پراندگی کی۔ خدا جانے یہ بات کس حد تک صحیح ہے۔"<sup>۱۰</sup>

سرور صاحب کی نشر کی رنگینی اور شکافتگی کی مخالفت اور موافقت میں ناقدین نے بہت

سی باتیں کہی ہیں لیکن یہ بات آج تک کسی نے نہیں کہی کہ یہ شگفتگی اور رنگینی شعوری ہے یا بنادوئی ہے یا مرصع کاری کا نتیجہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرور صاحب کی تحریر میں جو روائی ہے وہ کسی جوئے کم آب کی بجائے کسی پہاڑی جھرنے کی مثال پیش کرتا ہے۔ اس روائی کے سلسلہ میں ایک بات اور اہم ہے۔ سرور صاحب نے خود لکھا ہے کہ ایک زمانے میں وہ شام سے چھ سات گھنٹے مستقل بیٹھ کر ایک نشست میں مضمون مکمل کر لیا کرتے تھے۔ اور بیگم سرور نے اس کی تصدیق کی ہے کہ وہ دیر رات گئے تک پڑھنے لکھنے کا کام کرتے رہتے تھے۔ یہ تمام باتیں یعنی (۱) طبیعت کی لاپرواں، یا ترتیب و تنظیم کا نہ ہونا (۲) فطری مناظر خاص طور سے پہاڑوں سے عشق (۳) خط کا خراب ہونا (۴) دیر رات گئے تک کام کرنا (۵) اور ایک ہی نشست میں مضمون مکمل کرنا، سرور صاحب کی شخصیت کے جس پہلو کو پیش کرتی ہیں وہ ان کا فطرت سے قریب یا رومانی ہونا ہے۔ جس طرح فطرت ایک خود روپوں کی طرح بغیر کسی تراش خراش کے اپنی فطری شکل میں ارتقا پاتی ہے، اسے کسی تزمین و آرائش کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح سرور صاحب کی شخصیت اور اسلوب کو بھی تزمین و آرائش کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

سرور صاحب کی شخصیت کی جن دوسری خصوصیات کا ان کے ہم عصروں اور شاگردوں نے ذکر کیا ہے ان میں سے دو اہم خصوصیات ان کی کشادہ دلی اور کشادہ دستی ہے۔ سرور صاحب کی کشادہ دستی کا ذکر ان کے شاگرد ڈاکٹر نادر علی خان (ریڈر، شعبہ اردو، اے ایم یو علی گزہ) اپنی ایم اے کی کلاس میں اکثر کیا کرتے تھے۔ ان کے مطابق جس زمانے میں سرور صاحب کو آٹھ سوروپے تختواہ ملتی تھی اس زمانے میں سرور صاحب انھیں اپنی جیب خاص سے دو سال تک دو سوروپے اسکالر شپ دیتے رہے۔ ظاہر ہے آج کے دور میں جب بہت معمولی عہدہ داروں کی تختواہ ہیں بھی چار اور پانچ ہندسوں میں ہوتی ہیں کسی شخص کے لیے دو سال تک مسلسل اپنی جیب سے کسی طالب علم کو دو سوروپے اسکالر شپ دینا آسان نہیں ہے تو اس زمانے میں جب یہ رقم تختواہ کا ایک چوتھائی حصہ ہوتی تھی کتنا مشکل رہا ہوگا۔ روپے پمپے سے سرور صاحب کو فطری طور پر کم دلچسپی تھی۔ بقول پروفیسر شہریار جس زمانے میں وہ انجمان ترقی اردو کے سکریٹری تھے انجمان سے ملنے

والے اعزاز یے کی رقم کافی نہوں ان کے بریف کیس میں یوں ہی پڑی رہ جاتی تھی۔ اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ ریڈ یو، ٹی وی یا کسی اور ذریعے سے آئے ہوئے چیک ان کے بریف کیس میں اتنے دنوں رکھے رہ جاتے کہ وہ Invalid ہو جاتے تھے۔

جبکہ جہاں تک کشادہ دلی کا تعلق ہے اس سلسلہ کا ایک واقعہ کمال احمد صدیقی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے۔ ان کے الفاظ میں:

”۱۹۸۷ء، یا ایک برس بعد کا زمانہ ہے۔ انہمن ترقی پسند مصنفوں کے جلسے انہیں کے گھر پر لکھنؤ میں ہوتے تھے۔ انہوں نے جگہ مراد آبادی کی شاعری پر ایک بہسٹ مضمون پڑھا۔ بحث کا آغاز کرنے کے لیے مجھ سے کہا گیا۔ میں نے کہا گے سرور صاحب کا یہ مضمون جگہ مراد آبادی کی طرف سے نہیں جائیگا۔ اسے ذہنیت کی طرف سے ایک مفردت ہے۔ جگہ مراد آبادی کے جس تغزل، جن اولیٰ اقدار اور جس انسان دوستی اور عشق کے جس وقار اور سپردگی کو سرا با گیا ہے وہ سب جائیگا۔ سماج اور اس کے پیداواری رشتہوں سے جزو ہوئے ہیں یہ پہمانہ شاعری ہی نہیں بلکہ انحرافی شاعری ہے۔ جلسہ میں ڈاکٹر علیم، احتشام صاحب اور رشید جہاں کے علاوہ نوجوان اور انہوں نے جواب دیا۔ لیکن زور اس بات پر تھا کہ جو اعتراض کیے گئے وہ شاعری کی تفہیم سے عاری ہیں۔ اعتراض پرمی ہیں۔ سرور صاحب نے علیم صاحب اور احتشام صاحب کو بھی انہیار رائے کی دعوت دی۔ احتشام صاحب چپ رہے، لیکن علیم صاحب اور رشید جہاں نے کہا: کمال کے اعتراض صحیح ہیں۔ ہمیں اپنے انحرافی ادب کی وکالت نہیں کرتا چاہیے۔“

اس جلسے کے بعد سرور صاحب کے رویے میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

ایسا ہی ایک واقعہ پروفیسر محمد انصار اللہ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ان کے مطابق:

”اور میں مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریسرچ اسٹٹٹ ہو گیا۔ مجھے علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی تصحیح کا کام دے دیا گیا۔ سرور صاحب کے خلاف میں اتنی باتیں سن چکا تھا کہ اس عنایت پر بھی دل نہیں مختتا تھا۔ محض امتحاناً وہ کتاب لے کر سرور صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اس کتاب کا تو پہلا جملہ ہی ناط ہے۔ (وہ سرور صاحب ہی کا تھا) میں نے تفصیل عرض

کی۔ فرمایا آپ بے تکلف درست کردیں۔<sup>(۲)</sup>

ایک تیسرا واقعہ پروفیسر شیمیم حنفی نے لکھا ہے:

”پروفیسر! آپ جو کہہ رہے ہیں میں اسے مانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“ صدیق نے سگریٹ سلاگاتے ہوئے صفائی سے کہا۔ سرور صاحب نے پان کی گلوری منہ میں رکھی، مسکرائے پھر بولے: ”اچھا تو آپ ہی مجھے قابل کر دیجیے۔“ یہ مکالمہ سرور صاحب اور ان کے بینے کے مابین جاری تھا۔ یاد نہیں آتا کہ یہ بات کس نے لکھی ہے کہ سب سے کمزور دلیل وہ ہوتی ہے جس کی بنیاد مغض منصب، عمر یا اختیار کی برتری ہو۔ ایسے کئی موقعے آئے جب سرور صاحب ایسوں سے مکالموں میں مصروف دکھائی دیے جنہیں وہ چاہتے تو ذات پڑ کر یا بہلا پھسا کر چپ کر دیتے۔ نوجوانوں کا لمحہ یوں بھی سرکش ہوتا ہے۔ کچھ لوگ سرکشی کی داد دیتے بھی ہیں تو اس طرح گویا دوسرے پر احسان یا اپنی نرم خوبی کا اعلان کر رہے ہوں۔ ایسے لمحوں میں سرور صاحب بہیش برابری کی سطح پر گفتگو کرتے ہوئے دکھائی دیے۔<sup>(۳)</sup>

اس کشادگی قلب کے ساتھ ساتھ سرور صاحب کے یہاں کشادگی نظر بھی پائی جاتی تھی۔ وہ اپنی تحریر و تقریر میں مختلف انداز میں اس کا نمونہ پیش کرتے رہتے تھے۔ ”ہماری زبان کے ایک اداریہ میں ہمیں ہر چیز سے مطلب ہے کہ عنوان سے لکھتے ہیں: ”اردو کے شاعروں اور مصنفوں کا فرض ہے کہ وہ ہندی ادب کی رفتار پر بھی نظر رکھیں۔ ہندی میں شاعری کس طرح کی ہو رہی ہے؟ افسانے کیسے لکھے جا رہے ہیں؟ نثر کی ترقی کی رفتار کیا ہے؟ تنقید میں کن پبلووں پر خاص توجہ ہے؟ اسی طرح ہندی کے لکھنے والوں کو اردو، بُنگالی، تامل اور دوسری زبانوں میں ادب کی رفتار پر نظر رکھنا چاہیے۔ اس سے نہ صرف ہم ایک زبان کے جانے والوں کو دوسری زبان کے جانے والوں کے قریب کر سکیں گے ایک زبان کے اچھے اور معنی خیز تجربوں اور کارناموں سے فائدہ بھی اٹھا سکیں گے۔ اور پھر سب کو ہندوستانی ادب میں اور اس کے ذریعے سے ہندوستانی تہذیب میں ایک حیرت انگیز وحدت کا احساس ہو گا۔“

دوسری زبانوں کے علاوہ ہمیں دوسرے کاموں سے بھی سرور کار رکھنا ہے۔ سائنس کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ فنون اطبیفہ کی ترقی کی رفتار کیسی ہے؟ سیاست

کدھر جا رہی ہے؟ اقتصادی حالات کیا ہیں؟ جمہوریت کے ساتھ جمہوریت کے مانے والے کیا سلوک کر رہے ہیں؟ منصوبہ بندی کیوں اپنے مقاصد میں کوئی خاص کامیابی نہیں حاصل کر رہی ہے؟ کھیتوں میں بھوک کیوں اگ رہی ہے؟ لوگ ذرا ذرا سی بات پر بسیں، ریل کے ذبے، ذاک خانے کیوں جانے لگتے ہیں؟ طلباء کیوں بے راہ رو ہو رہے ہیں؟ تعلیم کا معیار کیوں گر رہا ہے؟ آج ہر وہ شخص جو آنکھیں کھلی رکھتا ہے اور جس کے پاس نغمیر نام کی کوئی چیز ہے کیوں دل شکست اور مر جھایا ہوا ہے۔<sup>۲۳</sup>

عملی طور پر بھی ان کی اس کشادگی نظر کا اندازہ تنقید کے بنیادی مسائل، سمینار کی رووداد کیجو کر لگایا جاسکتا ہے۔ اس سمینار میں جہاں اردو تنقید کے بنیادی افکار پر مضمایں پیش کیے گئے وہیں عربی، فارسی، سنسکرت، بندی اور انگریزی تنقید کے بنیادی افکار پر بھی مضمایں پیش کیے گئے۔ فلشن سمینار میں پڑھے گئے مضمایں بھی سرور صاحب کی اسی کشادگی نظر کو سامنے لاتے ہیں جس میں اردو فلشن کے ساتھ ساتھ بندی اور مراثی ناول پر بھی مضمایں شامل ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں جب انہوں نے بندوستانی یونیورسٹیوں کے لیے اردو کا ایک معیاری نصاب تیار کیا تو جہاں ایک لازمی پرچہ اسانیات اور صوتیات کا رکھا وہیں دو اختیاری پرچہ بھی رکھے۔ پہلے اختیاری پرچہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلا حصہ سنسکرت، فارسی اور انگریزی ادب کے شاہکاروں پر مشتمل تھا اور دوسرا حصہ جدید بندی ادب کے مطالعہ (بھارتیہ و ہریش چندر سے سمترا نندن پنت تک) پر مبنی تھا۔ طالب علم دونوں میں سے کوئی ایک پرچہ لے سکتا تھا۔ دوسرے اختیاری پرچہ کے تین حصے تھے۔ ا۔ فلسفہ کے اہم دبستانوں کا مطالعہ ۲۔ فنون اطیفہ کے مبادیات، ۳۔ بندوستان کی مشترکہ تہذیب کا مطالعہ۔ طالب علم ان تینوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ:

”ایم اے کے نصاب کے تعین میں حسب ذیل اصول ملحوظ رکھنے ہوں گے۔ طلبہ زبان کی لسانی اور صوتی خصوصیات، اس کی قواعد، اس کے دوسری زبانوں سے رشتے سے آگاہ ہوں گے۔ یعنی انھیں لسانیات کی مدد سے اپنی زبان کا مطالعہ کرنا ہوگا جس کے لیے لسانیات کے مبادیات کا علم لازمی ہوگا۔ انھیں

ادب کی تاریخ، اس کے اصناف کے ارتقا اور ادب کے شاہکاروں کا خاصاً گھبراً علم ہوگا۔ وہ اس سماجی اور تہذیبی پس منظر سے واقف ہوں گے جس میں اردو ادب نے جنم لیا ہے۔ اور پروان چڑھا ہے۔ وہ ان فکری میلانات پر نظر رکھتے ہوں گے جو اس کے محور کہے جاسکتے ہیں۔ وہ تقابلی مطابعہ کے لیے چند عالمی شاہکاروں یا کسی ہندوستانی زبان کے شاہکاروں سے کچھ واقفیت پیدا کریں گے۔ وہ تنقید کے ان اصولوں سے واقف ہوں گے جو سکرت، عربی، فارسی اور انگریزی کے ادب میں اہمیت رکھتے ہیں۔ اور ان اصولوں کی روشنی میں اپنے فن پاروں پر عملی تنقید کر سکیں گے۔ وہ فنون اظیفہ کی خصوصیات کا کچھ علم حاصل کر سکیں گے تاکہ انھیں حسن کاری کے مختلف آداب کا علم ہو خصوصاً فارم کا۔ اور اس کے سلسلہ میں مصوری، بہت تراشی، موسيقی اور فن تعمیر کے مہاذیات کو ذہن نشین کر سکیں گے۔<sup>۱۵</sup>

سرور صاحب کے یہاں برداشت کا مادہ غیر معمولی تھا۔ وہ مشکل سے مشکل حالات سے مسکراتے ہوئے گذر جاتے تھے۔ پروفیسر شیمیم حنفی نے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"برف باری دیر سے ہو رہی تھی... لوگ گھروں میں بخمرے سمنے بیٹھے تھے کمرے میں بخاری جل رہی تھی۔ اندر اور باہر کے درجہ حرارت میں فرق کا اندازہ اس وقت ہوا جب ہم برآمدے میں آئے۔

سرور صاحب نے سوت پر اودر کوٹ چڑھایا اور گھری دیکھتے ہوئے بوئے اب چلنا چاہیے۔ اقبال انسنی نیوٹ کی طرف سے یوم فانی کی تقریب تھی۔ میں نے دلبی زبان میں بس اتنا کہا:

'اس موسم میں کتنے لوگ آئے ہوں گے؟' سرور صاحب مسکرائے، بڑی نفاست کے ساتھ پان کی ایک گلوری منہ میں رکھی۔ ایک اچھتی نظر آسمان پر، پھر اسی طمائیت کے ساتھ یہ تقاضا کہ اب چلنے چاہیے ہم تو وقت پر وہاں موجود ہوں۔' مشکل سے پندرہ بیس لوگ رہے ہوں گے۔ چند خواتین، دو چار اساتذہ، کچھ طالب علم۔ جلد شروع ہوتے ہوتے اس تعداد میں دس پانچ کا اور اضافہ ہو گیا۔ سرور صاحب ایسے مطمئن اور مسرور دکھائی دیتے تھے جیسے سب کچھ معمول کے مطابق ہے۔ ہر عمل میں وہی انہاک اور گرم جوشی اور دلبی دلبی سی

مررت کا تاثر۔ نہ موسم سے شکایت نہ کسی سے یہ گھمہ کہ آیا کیوں نہیں۔ پہچے  
پڑھے گئے، بحثیں ہوئیں ۲۰

ایک دوسرا واقعہ پروفیسر کبیر احمد جائسی نے لکھا ہے:

"اس سال کشمیر میں زبردست برف باری ہو رہی تھی۔ جموں سے بس اپنے  
وقت سے روائے ہوئی۔ مگر ملن (Tunnel) پر اس کو روک دیا گیا کیونکہ ملن برف  
سے بھری ہوئی تھی۔ سرور صاحب رات بھر اسی بس میں بیٹھے رہے۔ وہ رات  
انھوں نے کیسے کافی یہ تو دی جانتے ہوں گے مگر جب سری نگر آئے تو اس واقعہ  
کی اطلاع دیتے ہوئے انھوں نے ہم لوگوں سے یہ بھی کہا جب صحیح کے وقت  
ہر طرف برف ہی برف اور حد نگاہ تک برف پوش چونیوں پر نظر پڑی تو وہ منظر  
اتنا دمکش تھا کہ سارا تکدر دور ہو گیا اور جسم و جاں نے ایک عجیب طرح کی  
فریحت محسوس کی۔ اس وقت سرور صاحب کی عمر ستر سال سے متباہز ہو چکی تھی  
جب اس عمر میں بھی غیر معمولی حالات سے مقابل ہونے کا ان کا یہ طریق تھی تو  
جو انی میں کیا رہا ہوگا اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔" ۲۱

سرور صاحب کی ایک بڑی خوبی زندگی کے ہر دور میں اپنے خاندان اور وطن کے  
لوگوں سے ان کا تعلق خاطر ہے۔ 'مکاتیب سرور' کے نام سے ان کے خطوط کا جو مجموعہ ان  
کے انتقال کے بعد شائع ہوا ہے اس کے خطوط میں وہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو  
مختلف قسم کے مشورے دیتے اور ان کی رہنمائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

توازن اور اعتدال کو سرور صاحب کی شخصیت میں بنیاد کی اینٹ کی حیثیت حاصل  
تھی۔ جولائی ۱۹۵۰ء میں جب ان کی ادارت میں 'اردو ادب' نکانا شروع ہوا تو پہلے  
شمارے میں ہی ان کا ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا 'توازن ... زندگی اور ادب  
میں' اس مضمون میں انھوں نے خاص طور پر جن باتوں پر توجہ دی تھی وہ یہ ہیں:  
"میری رائے میں اس دور کی بہت سی بیماریوں کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے  
جدبات و خیالات میں توازن نہیں ہے۔" ۲۲

"توازن کے معنی محض دو چلوں کو برابر رکھنا نہیں ہے۔ مخالف اور موافق  
دونوں کی رائے کو تسلیم کرنا، نئے اور پرانے دونوں کے زاویے نظر کو درست سمجھنا،  
رومانیت، کلاسیکیت، انفرادیت پرستی اور سماجی تصور، مشرق اور مغرب، سامنس

اور ادب، ماحول اور وراثت، دونوں کے حامیوں کی بات ماننا تو ازن نہیں کہا جا سکتا۔ تو ازن کے معنی دونوں کی اہمیت کا احساس رکھنا، دونوں کے دلائل کو تو لئن، اگر پلہ ایک طرف بہت جھکا ہوا ہے تو دوسرے پر زور دینا، اگر ایک کے ساتھ انصاف بالکل نہیں کیا گیا ہے تو اس کی طرف توجہ کرنا ہے۔ تو ازن زندگی کا مقصد یا نصب اعین نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ مکمل تو ازن مکمل سکون کی علامت ہے۔ مقصد یا نصب اعین تو ترقی ہی ہو سکتا ہے لیکن تو ازن طریقہ کار بن سکتا ہے۔ تو ازن منزل نہیں ہے۔ منزل تک صحیح و سالم پہنچنے کا راستہ ہے۔<sup>۱۹</sup>

"سانچنگ نقطہ نظر کے ساتھ انسانیت کے احساس کو ہی میں تو ازن کہتا ہوں۔"<sup>۲۰</sup>

"ترقی کے لیے علم کافی نہیں۔ علم و عمل کا صحیح تو ازن ضروری ہے۔"<sup>۲۱</sup>

یہ وہ خشت اول تھی جس کی درستی نے انھیں تاحیات سربند و سرخرو رکھا۔ وہ بیک وقت معاملہ کے ایک سے زیادہ پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے اور ہر پہلو کو یہ ساری اہمیت دینے کے قابل تھے۔ کوئی پہلو نظر انداز نہ ہو جائے، کسی پہلو پر اصرار زیادہ یا کم نہ ہو جائے، سب کو اس کی اہمیت کے مطابق حق ملے، ان باتوں کا وہ خاص طور سے خیال رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ۱۹۹۶ء میں جب پروفیسر ابوالکلام صاحب قائمی شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدر ہوئے تو انہوں نے مناسب سمجھا کہ اردو کے سب سے بڑے نقاد، دانش ور اور شعبہ اردو کے پروفیسر ایم ٹیس سے خصوصی ملاقات کر کے ان سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ یہ ملاقات سرور صاحب کے گھر پر ہوئی۔ سرور صاحب نے اس ملاقات میں پروفیسر قائمی سے جو گفتگو کی وہ ان کی شخصیت کی پہلو داری اور ہمہ جہتی کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔ سرور صاحب نے دریافت کیا کہ تاریخ زبان و ادب کا پرچہ کس استاد کے ذمہ ہے؟ علم بلاغت، علم عروض، قدیم متن اور زبان کی تدریس کن لوگوں کے ذمہ ہے؟ اور یہ مشورہ دیا کہ جو اساتذہ اس وقت یہ پرچہ پڑھا رہے ہیں ان کے علاوہ نسبتاً بعد کے لوگوں میں ایک ایک دو دو استاد کو ان پر چوں کی تدریس کے لیے تیار کیا جائے تاکہ موجودہ اساتذہ کے بعد وہ لوگ آسانی سے ان لوگوں کی جگہ لے سکیں۔ اسی طرح انہوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ کچھ لوگوں کو خاص طور سے

زبان کی تدریس کے لیے تیار کیا جائے اور اس کام کے لیے انھیں ایک ایک کر کے سینئر  
انسانی یوت آف انڈین لینگو تجز میں چھو چھو مہینے کی تربیت دلوائی جائے۔ اسی زمانے میں  
‘آزادی کے بعد اردو ناول’ کے موضوع پر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں  
ایک سہ روزہ سمینار ہونا تھا۔ سرور صاحب نے دریافت کیا کہ آپ نے جنوبی ہند سے کے  
مدعو کیا ہے؟ پنجاب سے کے بلا یا ہے؟ کشمیر سے کوئی آرہا ہے یا نہیں؟ بہار اور بنگال سے  
بھی کسی کو بلا یجیے۔ وہاں کے لکھنے والوں کی نمائندگی بھی ضروری ہے۔ اسلام کے علاوہ اور  
کتن گھن مذاہب کے ماننے والوں کو آپ نے مدعو کیا ہے؟ اسی طرح جن موضوعات پر  
مقابلہ پڑھے جانے تھے ان پر بھی انہوں نے گفتگو کی۔ اور لگ بھگ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں  
انہوں نے معااملے کی تمام نزاکتوں کی طرف پروفیسر قاسمی کی توجہ مبذول کر دی۔ بظاہر یہ  
باقی انتظامی امور سے متعلق معلوم ہوتی ہیں لیکن شخصیت کی پرکھ ایسے ہی معاملات میں  
ہوتی ہے۔

سرور صاحب کی دلچسپیاں صرف ادب تک محدود نہیں تھیں۔ ادب کے علاوہ اور  
دوسرے علوم و فنون کے جو ماہرین ان سے ملنے آتے ان سے بھی وہ یہ سوال پرورد کرتے  
تھے کہ وہ آج کل کیا پڑھ رہے ہیں؟ علی گڑھ کے سامنے دانوں میں پروفیسر سعید الفاظ  
چغتاً ان کے یہاں مستغل آنے والوں میں شامل تھے۔ ایک صحبت میں جب سرور  
صاحب کے سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ وہ Astronomy سے متعلق ایک نئی  
کتاب پڑھ رہے ہیں تو سرور صاحب نے فوراً ان سے اس کتاب کی فرمائش کر دی کہ آپ  
پڑھ لیں تو مجھے بھی پڑھوادیں۔ کچھ دنوں بعد جب چغتاً صاحب وہ کتاب لے آئے تو  
انہوں نے اس کتاب کا بالاستعیاب مطالعہ کیا۔ یہی حال ادبی تحریروں کا بھی تھا۔ نئی سے نئی  
اور نوآموز سے نوآموز لکھنے والے کی تحریریں ان کے مطالعے میں رہتی تھیں۔ پروفیسر وحید  
اختر مرحوم نے ایک صحبت میں ان کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ علی گڑھ آنے  
سے پہلے ایک مشاعرہ میں شرکت کے لیے میں ولی آیا تو جذبی صاحب مجھے اپنے ساتھ علی  
گڑھ لے آئے۔ یہاں آکر انہوں نے بڑے فاتحانہ انداز میں سرور صاحب سے میرا  
تعارف کرایا۔ سرور صاحب خاموشی سے سنتے رہے۔ پھر بولے جی ہاں! میں نے ان کی

فلاں فلاں تحریر پڑھی ہے۔ اس دن اندازہ ہوا کہ سرور صاحب اپنے چھوٹوں کی تحریروں کو بھی کتنی اہمیت دیتے تھے۔

آل احمد سرور اس عالم کی طرح تھے جو ایک بات کم جانے کے بجائے ایک بات زیادہ جان کر مرتا پسند کرتا ہے۔ آخر وقت تک ان کے اندر سکھنے کا جذبہ کار فرماتھا۔ ۱۹۹۱ء میں جب انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا تو رسالہ 'آج کل' (اردو) دبیلی نے ان پر شمس الرحمن صاحب فاروقی کا ایک مضمون شائع کیا۔ مضمون کا عنوان تھا 'مرافقتہ النور فی ذکر السرور آج کل' کا متعلقہ شمارہ جب ان کی خدمت میں پہنچا تو یہ طالب علم ان کی خدمت میں حاضر تھا۔ سرور صاحب نے ریپر کھوا، مضمون دیکھا، مسکرائے۔ پوچھا "مرافقت کے کیا معنی ہوتے ہیں؟" جواب انکار میں تھا۔ سرور صاحب نے اسے پلیٹس کا لغت نکالنے کا حکم دیا۔ پھر اس میں اس لفظ کے معنی دیکھئے اور بتایا کہ 'مرافقت' کے معنی رفاقت کے ہوتے ہیں۔ یعنی سرور کا ذکر نور کی رفاقت ہے۔

ایک دن یہ طالب علم پروفیسر سرور کے نام ابوالکلام آزاد کے خطوط نقل کر رہا تھا۔ مولانا نے خط کے نیچے دائیں جانب سرور صاحب کا نام اس طرح لکھا تھا :

جناب آل احمد صاحب سرور  
لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

اس طالب علم کے پوچھنے پر پروفیسر سرور نے بتایا کہ 'صاحب' کے استعمال کی صحیح جگہ یہی ہے۔ نام کے فوراً بعد 'صاحب' اور اس کے بعد تخلص وغیرہ لکھنا چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مولانا آزاد اس کا خاص طور سے اہتمام کرتے تھے۔

خودنوشت کی تصنیف کے زمانے میں جب ترکی کے شہر 'المآتا' کا نام آیا تو انھوں نے اس طالب علم کو بتایا کہ ترکی میں 'الماء' کے معنی 'سیب' اور 'آتا' کے معنی 'باپ' کے ہوتے ہیں۔ 'آتا ترک' میں بھی آتا کے یہی معنی ہیں۔ ایک مرتبہ سکندر علی وجد کا ایک خط نقل کرنے کے لیے دیتے ہوئے سرور صاحب نے میر کا ایک شعر پڑھا۔

پھر نظر آیا نہ کچھ جز شعلہ پر چیج و تاب  
شم تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

## پھر وجد کا شعر سنایا۔

شعلہ شمع کی لووجد ذرا تیز ہوئی  
واہ رے زندگی مختصر پروانہ

پھر اس طالب علم سے پوچھا کہ دونوں میں سے کون سا شعر زیادہ بہتر ہے۔ ظاہر ہے اس نوازموز کے لیے میر کے شعر کے مقابلے میں کسی اور کے شعر کو ترجیح دینا ممکن نہیں تھا لیکن وہ چپ رہا۔ جب دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تو فرمایا کہ میر کی اہمیت، بڑائی اور میر کے شعر کی خوبی اپنی جگہ پر مسلم ہے لیکن ان دونوں اشعار میں وجد کا شعر میر کے شعر سے آگے بڑھ گیا ہے۔ میر کے شعر میں پروانہ کے شمع تک جانے اور شعلہ کے بلند ہونے کی پوری داستان بیان ہوئی ہے جبکہ وجد کے شعر میں صرف شمع کی لو کے تیز ہونے کا ذکر آیا ہے۔ میر نے چار الفاظ کی ترکیب کے ذریعے جو بات کہی ہے وہ وجد کے یہاں شعلہ شمع کے تیز ہونے کے ذریعے زیادہ آسانی سے بیان ہو گئی ہے۔ مجموعی طور پر بھی وجد کے یہاں الفاظ کم ہیں۔ پھر پہلے مصرع میں 'ذرا' اور دوسرے میں 'واہ' اور مختصر کے الفاظ نے اس میں اور بھی لطف پیدا کر دیا ہے جو میر کے شعر میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ تربیت کا ایک انداز تھا جس میں ہرے ناموں سے مرغوب نہ ہونے اور فن کی خوبی یا خامی پر نظر رکھنے کا بنیادی سبق شامل تھا۔

سرور صاحب ایک ثبت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ناخوشگوار سے ناخوشگوار حالات میں بھی کوئی نہ کوئی خوشگوار پہلو تلاش کر لیتے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو آدھے گلاس پانی کو آدھا خالی کرنے کے بجائے آدھا بھرا ہوا کرتے ہیں۔ وہ زمانہ کے شاکی کبھی نہیں رہے۔ اپنے ذاتی دکھوں اور پریشانیوں کا اظہار انھوں نے کبھی نہیں کیا۔ اپنے فکر و عمل سے وہ ہمیشہ غالب کے اس شعر کی تشریع پیش کرتے رہے۔

ہے رنگ لالہ و گل و نریں جدا جدا

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

ہر رنگ میں بہار کے اثبات کی اسی کوشش نے انھیں ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں لگائے رکھا اور کبھی تھکنے، مایوس یا مضمضہ ہونے نہیں دیا۔

## حوالے

- ۱ مضمون، سرور صاحب از وقار عظیم نقوش لاہور، شخصیات نمبر، ص ۷۹۷
- ۲ ”پروفیسر آل احمد سرور“، از نور الحسن نقوی، مطبوعہ سہ ماہی الفاظ، علی گڑھ، جنوری تا جون ۲۰۰۲ء، ص ۸
- ۳ ایضاً، ص ۱۲
- ۴ خواب باقی ہیں، آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۱ء، ص ۳۵۸
- ۵ ایضاً، ص ۸
- ۶ بیگم سرور سے خصوصی ملاقات مطبوعہ فکر و نظر، علی گڑھ، سرور نمبر نومبر ۳، ۲۰۰۳ء، ص ۲۹۲
- ۷ سرور صاحب ایک یادداشت، صدیق الرحمن قدوالی، ہماری زبان، دہلی آل احمد سرور نمبر کیم تا ۲۸ اپریل ۲۰۰۲ء، ص ۱
- ۸ آل احمد سرور: دانشور، نقاد اور شاعر، ترتیب و تحریر: شاہد مالی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۹۱ء، ص ۳۶
- ۹ خواب باقی ہیں، ص ۷۲۹
- ۱۰ ایضاً، ص ۷۲۹
- ۱۱ آل احمد سرور: دانشور، نقاد اور شاعر، ص ۲۳
- ۱۲ ایضاً، ص ۶۱
- ۱۳ آل احمد سرور: شخصیت اور فن مرتبہ امتیاز احمد، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۷ء، ص ۳۰
- ۱۴ ہماری زبان، علی گڑھ، ۱۵ اپریل ۱۹۶۶ء
- ۱۵ ہماری زبان، علی گڑھ، ۸ اکتوبر ۱۹۶۶ء

## شخصیت

41

۱۶ آل احمد سرور: شخصیت اور فن، ص ۲۷

۱۷ ایضاً، ص ۵۵

۱۸ سہ ماہی اردو ادب، علی گزہ، جولائی ۱۹۵۰ء

۱۹ ایضاً

۲۰ ایضاً

۲۱ ایضاً

## شاعری

آل احمد سرور کی شاعری کو ان کی تنقید سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان کی کمی کو  
ان کی شاعری سے۔ دونوں ایک دوسرے سے روشنی اور گرمی حاصل کرتے ہیں۔ انہوں  
نے خود لکھا ہے:

”میرے خیال میں میری شاعری سے میری تنقید کو اور میری تنقید سے میری  
شاعری کو مدد فی ہے۔“

اسی طرح شاعری اور اچھی شاعری کے بارے میں بھی انہوں نے اظہار خیال کیا  
ہے۔ لکھتے ہیں :

”اچھی شاعری وہ ہے جو ذہن میں چڑاغاں کر دے۔ جو ماوس جلوؤں کو تازگی  
اور تازگی کو ماویت عطا کرائے۔ جوز بان کے اپنے مخصوص استعمال سے، اپنی  
تمہاری سے، اپنے ابہام سے، اس دریو کو کوزے میں سودینے کی صلاحیت  
سے، ہمیں زندگی کے حسن، اس کے نیزگ، اس کے تضادات، اور اس کی  
پہنچی سے آشنا کر دے۔ وہ ہمیں زیادہ حساس، زیادہ مہذب بنادے۔ وہ ہمیں  
زندگی کے ہر منظر سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت عطا کرے۔ وہ ہمیں بہتر  
انسان بنادے۔ شاعری انقلاب نہیں لاتی، انقلاب کے لیے فضا ہموار کرتی  
ہے۔ یہ تکوار نہیں نشر ہے۔“

ان کے پہلے مجموعہ کلام، سلبیل (۱۹۳۵ء)، کی ایک نظم، ایک شاعر کا گیت، سے بھی  
ہمیں اس سلسلہ میں مدد ملتی ہے۔ اس نظم کے یہ اشعار دیکھئے ۔

راز حیات قوم پہ افشا کریں گے ہم  
یعنی کے داغِ انجمن آرا کریں گے ہم

سوئی ہوئی فضا کو جگائے گی شاعری  
بجلی خوشیوں پہ گرائے گی شاعری

برسون رہے اسی فریبِ مجاز میں  
پردے حقیقوں سے انھائے گی شاعری

روح عمل ملے گی صداقت کے جام میں  
بیداریاں انھیں گی ہمارے پیام سے

ان اشعار پر غور کریں تو راز حیات، سینے کے داغ، حقیقوں کے پردے، روح عمل،  
جام صداقت وغیرہ تراکیب خاص طور سے قارئی کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ ان سے  
شاعری کے ایک مقصدی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ جسے ہم بڑی حد تک پیامی شاعری کا نام  
دے سکتے ہیں۔ اور اس کے پس پشت اس دور کے شعری منظرناے پر چھائی ہوئی ایک  
بڑی شخصیت یعنی علامہ اقبال کی شاعری کے آہنگ، افظیات اور رویے کو محسوس کیا جاسکتا  
ہے۔ اسی مجموعہ کی ایک دوسری نظم 'خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ' میں بھی اقبال کی  
شاعری کے یہ اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

سر لیے بیٹھا ہوں میں سودا لیے بیٹھا ہوں میں  
ساری دنیا سے الگ دنیا لیے بیٹھا ہوں میں  
تاکے یہ در فشانی تاکے دامن کی خیر  
آنسوؤں کا نام ہے دریا لیے بیٹھا ہوں میں  
کوئی دیکھے تو مرے جوش جنوں کی وسعتیں  
اپنے گھر میں وسعت صحرا لیے بیٹھا ہوں میں  
خاک کیا میں نے تو خاکستر بنالی زندگی  
دل نہیں دل میں کوئی شعلہ لیے بیٹھا ہوں میں  
لااؤ دیکھوں تو انھا کر روئے روشن سے نقاب  
کس لیے یہ دیدہ بینا لیے بیٹھا ہوں میں  
جو مجھے تیرے سوا ہر شے سے کر دے بے نیاز  
اپنے پہلو میں وہ استغنا لیے بیٹھا ہوں میں

شوق بے پایاں، خلش پیغم نظر انجم شکار  
 کیا بتاؤں آپ کو کیا کیا لیے بیخا ہوں میں  
 اس نظم میں بھی خوش جنوں، درفشانی، سودا، وسعت صحرا، شعلہ، خاکستر، دیدہ بینا،  
 استغنا، شوق بے پایاں، خلش پیغم اور انجم شکار جیسی ترکیبیں جہاں ایک طرف کلاسیکی اردو  
 شاعری کے اثرات کی نشاندہی کرتی ہیں وہیں اقبال کے حاوی اثرات کو بھی ظاہر کرتی  
 ہیں۔ یہی حال ان کی طویل نظم 'الله صحراء' کا بھی ہے جو مولانا محمد علی جوہر سے متعلق ہے۔  
 ظاہر ہے اس 'الله صحراء' کا اقبال کی شاعری سے جو تعلق ہے اس کی وضاحت کی ضرورت  
 نہیں۔

من مثالِ اللہ صحرائتم  
 درمیانِ محفلے تہبا ستم

(میں اللہ صحراء کی طرح سے ہوں جو بھری محفل میں تہبا ہے) (اسرارِ خودی)  
 اس نظم میں استعمال ہونے والی تراکیب کا صرف ایک سرسری جائزہ لیں تو بھی  
 غنمت رفت، رہنمائے قوم، سوز ملی، روح بیداری، بیداری ملت، ذوق یقین، سرخون  
 شہیداں، درد قومی، ذوق نظر، بانگ درا، جوش عمل، ملت بیضا، پیغام حیات، سلطنت کی  
 ساحری، جنگ زرگری، قومیت کی روح، دعوت ذوق عمل اور بعض دوسری تراکیب اقبال  
 کے اثرات کو ظاہر کرنے کے لیے بہت کافی ہیں۔

یہی نہیں، غور ہے دیکھیں تو فطرت سے ان کا لگاؤ بھی جو پہلے شعری مجموعہ 'سلسلیں'  
 کی اکثر نظموں میں ملتا ہے روایتی کلاسیکی لفظیات کے باوجود ہری حد تک اقبال کا ہی  
 فیضان معلوم ہوتا ہے۔

بعد کے زمانے میں (دوسرے مجموعے 'ذوق جنوں' اور تیسرا مجموعہ 'خواب اور  
 خلش') آل احمد سرور کی شاعری میں شعری تجربے کے بجائے بیان یا Statement پر جو  
 زور ملتا ہے وہ بھی کسی طرح شاعر مشرق کی پیامی شاعری کے اثر کو ہی ظاہر کرتا ہے۔  
 سرور صاحب کے بیان یا Statement کے یہ اشعار دیکھیے۔

شاعری کو زندگی سے کچھ الگ پاتے ہیں لوگ  
 زندگی کی شاعری کو بھولتے جاتے ہیں لوگ  
 ہم نہ اس نوی میں تھے یا وہ نہ اس نوی میں تھے  
 نے کسی کی جیب میں تھے نے کسی جھوپ میں تھے  
 مانا کہ اس کے ساتھ بلا نہیں بھی آئیں گی  
 کھڑکی کھلی تو تازہ ہوا نہیں بھی آئیں گی  
 کبھی دھوپ ہے، کبھی چھاؤں ہے، کبھی اشک ہیں، کبھی زمزہ  
 یہ جو شاعری کا تضاد ہے اسی زندگی کا تضاد ہے  
 لوگ آزادی انکار سے ڈرتے ہیں یہاں  
 ذہن جو ملتا ہے یا راز و زبوں ملتا ہے  
 ہمیں تو میکدے کا یہ نظام اچھا نہیں لگتا  
 نہ ہو سب کے لیے گردش میں جام اچھا نہیں لگتا  
 خدا پرست ملے اور نہ بت پرست ملے  
 ملے جو لوگ وہ اپنے نشے میں مست ملے  
 اہل دانش ہوئے ارباب سیاست کے مرید  
 ایسی پستی پر مرے دل میں چھرمی لگتی ہے  
 لوگ مانگ کے اجائے سے جس ایسے مرعوب  
 روشنی اپنے چرانوں کی بری لگتی ہے  
 بطن سے روایت کے تجربہ نکلتا ہے  
 توڑ کر چنانوں کو سیل آب چلتا ہے

اسی بیان یا Statement کی شاعری کا ایک حصہ وہ بھی ہے جو آل احمد سرور کے یہاں طنز و تعریض کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ مختلف صورت حالات پر طنز کرتے ہوئے سرور صاحب کے یہ اشعار قابل ذکر ہیں ۔

کون اپنے بت ترائے؟ کون یہ زحمت کرے  
دوسروں کے ہی گھروں سے بت چڑھاتے ہیں لوگ

جو ملی چلتی ہوئی گاڑی اسی پر چڑھ گئے  
کیا ستم ہے پھر بھی دانشور کہے جاتے ہیں لوگ

رنگ اپنی خاصیت کھو دیں تو پھر کیا کیجیے  
ہر سیاہی کو سفیدی کہہ کے سجدہ کیجیے

اس مشینوں کے دھوئیں، اس بستیوں کی دھنڈ میں  
آسمان والے زمین پر روشنی کیسے کریں

اک بیان اور طنز یا طنزیہ بیان کے ساتھ سرور صاحب کی شاعری میں خواب / حقیقت، عشق / عقل، نور / ظلمت کی کشکمش سے پیدا اشعار کا ایک سلسلہ ملتا ہے جو ایک مرتبہ پھر انھیں اقبال کے حلقہ بگوشوں میں شامل کر دیتا ہے اور قاری کو مسلسل یہ احساس دلاتا رہتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ سرور صاحب اقبال کے ابتدائی ناقدین میں ہیں بلکہ نوجوانوں بالخصوص شاعروں اور ادیبوں کی اس نسل سے بھی تعلق رکھتے ہیں جن کو نہ صرف شعر و ادب میں بلکہ عملی زندگی میں بھی اقبال کے افکار و نظریات نے متاثر کیا تھا۔ ان کے یہ اشعار دیکھیے جو صرف صنعت تضاد کا نمونہ پیش نہیں کرتے بلکہ اس کشکمش سے پیدا صورت حال کو سامنے لاتے ہیں اور کسی وضاحت یا صراحت کے محتاج نہیں ہیں ۔

ظلمتوں کی اس قدر ہیبت ہے طاری رات  
اب دیے سہے ہوئے ہیں روشنی کیسے کریں

رات کا جشن منانے والے گواکثر پچھتاتے ہیں  
وہ بھی تو شرمایا ہوگا جس نے سحر کا ساتھ دیا

دھنڈلی دھنڈلی ساری فضا ہے کیسے اس کا حال کھلے  
 کس نے شب کا دامن تھاما کس نے سحر کا ساتھ دیا  
 اجائے ہم نے مانگے تھے، اندھیرا ہی مقدر ہے  
 اب اس کے بعد کس منہ سے کہو کوئی دعا مانگیں  
  
 اندھیرے میں اجائے کی تمنا سب کو ہوتی ہے  
 اندھیرے میں بھٹکنے کی روشن جاتی ہے مشکل سے  
  
 اہل دانش رہے آرائش افکار میں گم  
 سرفروشی کو جو نکلے تو دوانے نکلے  
  
 گدائے خواب بھی، پا بستہ حقیقت بھی  
 خدا کی بستی میں انساں خراب کیسا ہے  
  
 خوابوں کی ہر خلش کو خطا کہہ رہے ہیں لوگ  
 قدروں کی جستجو کو سزا کہہ رہے ہیں لوگ  
  
 تاریخ کا بہاؤ، حقیقت کا آئینہ  
 اپنے خیال خام کو کیا کہہ رہے ہیں لوگ  
  
 پوچھتے ہو کہ یہ خوابوں کی پرستش کیوں ہے  
 ہر حقیقت انھی خوابوں سے بنی ہے اے دوست  
  
 کون خوابوں کو حقیقت میں بدل سکتا ہے  
 ہاں حقیقت انھی خوابوں سے سنور جاتی ہے  
  
 یہ عمر مجھ سے خرد کا وقار مانگے ہے  
 دل اب بھی شوق کے لیل و نہار مانگے ہے

حقیقوں کو خمار تخلیقات کہیں  
چلو کہ اب خرد سے جنوں کی بات کہیں  
نوازے شوق میں شورش بھی ہے قرار بھی ہے  
خرد کا پاس بھی خوابوں کا کاروبار بھی ہے

ان تمام اشعار میں راجح شعری طریق کا Poetic Devices کا استعمال نہیں ملتا ہے اور نہ ہی زبان کے Binary Opposition کے نظام کو کسی ایک مقصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ بلکہ اس نظام سے پیدا تباہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ Binary Opposition کا یہ سلسلہ بھی آمیزش کو جنم دیتا ہے کبھی آمیزش کو۔ کبھی گدائے خواب پاہتہ حقیقت نظر آتا ہے اور خواب حقیقوں کی تعمیر و تکمیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں تو کبھی فضنا کا دھندا اپن نور و ظلمت میں فرق مشکل کر دیتا ہے۔ اور کبھی ظلمت میں اتنی حاوی ہو جاتی ہیں کہ روشنی پھیلانے والا دیا بھی اپنے آپ کو بے بس پانے لگتا ہے۔

اقبال کے بعد آل احمد سرور کی تخلیقات پر سب سے گھرا اثر ترقی پسند تحریک کا ہے۔ لیکن سرور صاحب کی خوبی یہ ہے کہ اپنی تمام ترقی پسندی کے باوجود وہ کبھی کف دردہاں نہیں ہوئے۔ انہوں نے ترقی پسندی کے ثابت پہلوؤں کو اپنایا، لیکن پہلے سے بننے بنائے ہوئے کسی بت کو توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے فی ایس ایلیٹ کے مضمون روایت اور انفرادی صلاحیت کا نہ صرف یہ کہ اپنی تحریریں میں بار بار حوالہ دیا اور اس سے بکثرت استفادہ کیا بلکہ اپنے تخلیقی سفر میں بھی روایت کے دائرے میں رہتے ہوئے تسلسل کے ساتھ تبدیلی کی کوشش کی۔ نتیجہ کے طور پر ان کے کلام میں کسی حد تک احتجاج کا عنصر تو ضرور در آیا لیکن جھنجھلاہٹ یا کلمبیت کا شاید بھی پیدا نہیں ہوا۔ ایک بہتر معاشرہ کی خواہش اور خواب کا ذکر تو ان کے شعرو ادب میں آیا لیکن پہلے سے موجود معاشرتی نظام کی تباہی کی قیمت پر نہیں بلکہ ان میں تبدیلی کی صورت میں۔ چنانچہ ان کی نظموں ’بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو، ’تم کیسے شاعر ہو، او، ’ہمیں سکھایا گیا تھا، میں ان کی شاعرانہ شناخت کا یہ عنصر بہت واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ’بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو، کے یہ مصرع پیش کیے جاسکتے ہیں۔

بناو کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو  
یہ کوشش کروں  
سرپرستی ملے اک بڑے آدمی کی  
اور اونچے سے اک پیڑ پر رینگتی نیل بن کر  
بلندی کی جانب کھلکھلتا رہوں  
جبہاں میں اکیلا کھڑا ہونہ پاؤں  
نبیس شکریہ

شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کی سرپرستی کرنے اور ان کو ملک اشعرانی کا تاج پہنانے والوں کے خلاف اس بند میں جو بغاوت اور احتجاج ہے وہ ”نبیس شکریہ“ پر آکر انتہائی واضح اور شدید ہو جاتا ہے۔ سرور صاحب کے یہاں ان سرپرستوں کو ٹھکرانے، انھیں حقیر سمجھنے اور ان کے سامنے کبھی Surrender نہیں کرنے کا جذبہ انتہائی واضح صورت میں سامنے آتا ہے۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ شاعر، ادیب اور فنکار اس لیے نہیں ہوتا ہے کہ کسی نولی یا جھوٹی میں پڑ جائے بلکہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے اور اپنی آزادی پر اصرار کرنے میں ہی اس کے کردار کی بڑائی کا راز پوشیدہ ہے۔  
ہم نہ اس نولی میں تھے یا رو نہ اس نولی میں تھے  
نے کسی کی جیب میں تھے نے کسی جھوٹی میں تھے

دامن پہ ان کے ہاتھ حرینانہ پڑ گیا  
بغز و نیاز اپنا مقدر نہ ہو سکے

زندہ ہیں ہم سے ایسے کچھ آداب سرکشی  
جو تیری زلف کو بھی میر نہ ہو سکے

ان کا شعری کردار اپنے سرپرستوں کے سہارے اس بلندی پر نہیں پہنچنا چاہتا ہے  
جبہاں وہ ساری دنیا سے کٹ کر الگ ہو جائے اور صرف اس سہارے کا متلاشی رہے جو اس کی سرپرستی کر سکے۔ کیونکہ یہ سرپرستی اسے فنکارانہ بصیرت اور وژن نہیں دے سکتی، اسے

ان تجربوں سے دو چار نہیں کر سکتی جو اس کے لیے تخلیقی محرک کا کام کرتے ہیں۔ یہ تو اسے اس کے حقیقی معاشرہ میں ہی مل سکتا ہے کیونکہ یہی اس کی اصل طاقت ہے۔ رینگتی بیل کا استعارہ یہاں خاص طور سے اہمیت رکھتا ہے۔ بیل اپنے بھروسے کھڑے ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اسے کسی سہارے کی تلاش ہوتی ہے جو اسے اوپر اٹھا سکے۔ جبکہ شاعر، شعری کردار وہ درخت بناتا چاہتا ہے جس کی جزیں اپنی زمین میں پوسٹ ہوں اور اس کی شاخیں فضا میں آزادانہ سانس لیتی اور سرست و بے خود جھومتی رہتی ہیں۔ مذکورہ نظم میں وہ آگے چل کر کہتے ہیں ۔۔۔

میں اور ووں کی مانند  
کبازی کو بنے کو نظم میں معنوں کروں  
بنوں مخرا اس ذلیل آرزو میں  
کہ اک سرد چہرے سے چھوٹے تبسم  
نہیں شکریا

ای شدت کے ساتھ وہ اس کی مزید تفصیل پیش کرتے ہیں ۔۔۔  
کسی کی خوشامد کروں میز پر ناشتے کی  
میں گھنؤں کو بے حس بنالوں  
لپک ریڑھ کی ہڈیوں کو یہاں تک سکھا لوں  
زمیں پر گھستتے ہوئے پیٹ اپنا گھسا لوں  
نہیں شکریا

بنوں پشت خار اس سور کا  
جو میرے لیے چند سکے اچھائے  
میں اک ہاتھ سے خداوند دولت کی سینگوں کو سہلاوں  
اور دوسرا ہاتھ اپنی خودی کے نشے میں  
(اپنے ساتھی کے دھنڈے سے بیگانہ)  
چپکے سے فیس اپنی لیتار ہے

نبیس شکریہ

خدا نے مجھے جو بھی شعلہ دیا ہے

اس سے لو بان سلگاؤں دن بھر

پتھری اک ناک کے سامنے

ایک لکڑی کے چہرے کے آگے

نبیس شکریہ

یہ کردار صرف ایک گیت پر اپنی ساری شہرت کی بنیاد نبیس رکھنا چاہتا۔ وہ یہ بھی نبیس چاہتا  
کہ۔

کم و بیش کامیں لگاؤں حساب

کروں جوڑ توڑ

کسی سے ملاقات کا چاؤ ہو

شعر کہنے سے زیادہ

تعارف، مراعات، اثر

ڈھونڈتا ہی رہوں

نبیس شکریہ

آپ کا شکریہ

وہ یہ چاہتا ہے کہ

مگر میں تو یہ چاہتا ہوں

کے گاؤں، ہنسوں، خواب دیکھوں

راہ اپنی چلوں، بس اکیلا رہوں

اور آزاد ہو کر

دیکھوں چیزوں کو جیسی وہ ہیں

ہو وہ آواز جو مرد غازی کی ہے

اظاہر یہ نظم کسی دوسری زبان کے فن پارہ کا ترجمہ ہے۔ لیکن اس کے پس پشت

آل احمد سرور کی پوری شخصیت اور ان کے تنقیدی نظریات ہمیں صاف دکھائی دیتے ہیں۔

یہی کسی ترجمہ کا جواز بھی ہے اور ترجمہ کے لیے منتخب کیے گئے فن پارہ کی غلطیت کا ثبوت بھی ہے کہ وہ زمان، زبان، تہذیب اور ملک کی حدود کو پار کر کے دوسرے زمانہ، دوسری زبان، دوسری تہذیب اور دوسرے ملک کے لوگوں کے لیے بامعنی بتتا ہے۔ آل احمد سرور کی تنقید کی طرح ان کی شاعری کی یہ صفت بھی قابل ذکر ہے کہ انھیں جہاں کہیں اپنے کام کی بات نظر آتی ہے۔ وہ اسے اپنانے سے گریز نہیں کرتے۔

نظم 'تم کیسے شاعر ہو' اور 'ہمیں سکھایا گیا تھا' میں بھی یہی نقطہ نظر سامنے آتا ہے۔

"تم کیسے شاعر ہو" اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس میں انکار کے دور میں اثبات اور اثبات کے دور میں انکار پر اصرار کرنے کا ان کا دانشورانہ نقطہ نظر سامنے آتا ہے۔

نظم 'ہمیں سکھایا گیا تھا' اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں ماضی اور حال کے تضادات کی روشنی میں حال کی تلمیخیوں اور اداسیوں کا نوجوان غمہ بن کر سامنے آیا ہے۔

وہ سارے فقرات گئے ہیں

کہاں کے جلوے کہاں کے نفعے

اداں نظریں، اداں چہرے

نہ آگہی کا حساب باقی

نہ وہ جنوں کی شراب باقی

گھری میں جینا، گھری میں مرنا

اسی طرح صبح و شام کرنا

سبو جو خالی پڑا ہوا ہے

اسی سے ہر لحظہ جام بھرنا

ان تخلیقات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۵۵ء میں جذبی نے سرور صاحب کے سلسلہ میں جوشک و شبہ ظاہر کیا تھا۔

مجھے یہ ڈر ہے ترے ذوق بت نوازی سے

یہ بت کہیں ترے چیخ خدا نہ بن جائیں

وہ آخر آخر تک درست ثابت نہیں ہوا۔ ان کا شعری سفر جو 'سلسلیں' کی مناظر فطرت

کی شاعری سے شروع ہوا تھا اور ان کے دور شباب کو ظاہر کرتا تھا دوسرے مجموعہ کے دور کہولت سے ہوتا ہوا تیرے مجموعہ میں شیخوخت کے دور میں پہنچتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اس شیخوخت کی سنجیدگی اور پنځتلگی کے ساتھ ان کے یہاں شباب کی رعنائی بھی برقرار رہی۔ جیسا کہ خود انھوں نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے آخر عمر میں بھی ”کوئی حسین چہرہ کوئی اچھا شعر“ ان کے اندر زندگی کی لہر دوزا دیتا تھا۔ اپنی تنقید کی طرح اپنی شاعری میں بھی وہ بھی (Out Dated) نہیں ہوئے۔ آخر آخر عمر میں بھی اپنے آپ کو نہ دہرانا، نئے سے نئے حالات سے اپنے آپ کو مانوس رکھنا اور زندگی کی لہر دوزانے والے اشعار کی تخلیق کرنا ان کا خاص امتیاز کہا جاسکتا ہے۔ ان کی شعری تخلیقات اس امتحار سے بھی قابل ذکر اور قابل مطالعہ ہیں کہ ترقی پسندی، جدیدیت اور پھر مابعد جدیدیت کے دور سے گذرتے ہوئے بھی اس میں ایک کلائیکی رچاؤ، ایک مخصوص انفرادیت کے ساتھ اپنے دور کے درود داغ اور سوز و ساز کا احساس ملتا ہے۔ جون ایلیا نے آج کے دور کے انسان کو سامنے رکھ کر کہا تھا۔

ہمارے بعد جو آئیں انھیں مبارک ہو  
جہاں تھے کنج وہاں کارخانے ہو گئے ہیں  
پروفیسر سرور کنج کی تلاش میں کارخانوں کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے لیکن یہ ضرور  
کہتے ہیں۔

یہ تجارت کا، سیاست کا، صحافت کا ہے دور  
آج کے دور میں کوئی نہ محبت مانگے!

## حوالے

۱- خواب باقی ہیں، آل احمد سرور، ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۱ء، ص ۳۲۲

۲- ایضاً، ص ۳۲۲

## ادبی صحافت

پروفیسر آل احمد سرور کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۳ء میں علی گزہ میگزین کی ادارت سے ہوا۔ اس سے پہلے ان کی بعض تحریریں فانی بداعویٰ اور مانی جائی کے رسالہ، تسلیم، اور سینٹ جانس کالج آگرہ کی میگزین میں شائع ہو چکی تھیں۔ ۱۹۳۴ء کے علی گزہ میگزین میں بھی ان کا ایک مضمون 'سررائلہ راس' کے عنوان سے شائع ہو چکا تھا، لیکن بقول پروفیسر سرور:

"علی گزہ میگزین کی ادارت کے زمانے میں نشر کی طرف توجہ ہوئی۔ سرور صاحب نے علی گزہ میگزین کے چار شمارے مرتب کیے۔ ان شماروں میں سرور صاحب کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا پورا موقع ملا۔ ان شماروں میں انہوں نے نہ صرف مختلف موضوعات پر مضامین مرتب کر کے شائع کیے بلکہ مختلف کتابوں پر تبصرے کیے، ادارے لکھے اور یونیورسٹی کی سرگرمیوں کا بھی جائزہ لیا۔ انہی تحریروں میں سرور صاحب کا وہ مضمون بھی شامل ہے جو انہوں نے رشید جہاں، سجاد ظہیر، احمد علی اور محمود الظفر کے افسانوں کے مجموعہ 'انگارے' پر لکھا تھا۔ اور جس میں انہوں نے 'انگارے' پر خاصی سخت تنقید کی تھی۔ ان تحریروں میں حفیظ کی شاعری پر سرور صاحب کا مضمون اور گوئے کے ناول 'نو جوان' و رتھر کی داستان غم، پر ان کا تبصرہ بھی شامل تھا۔ ان تحریروں نے ادبی حلقہ میں سرور صاحب کو متعارف کرایا۔"

تین سال بعد ۱۹۳۶ء میں سرور صاحب نے مشہور طنز و مزاح نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ساتھ مل کر 'سہیل' کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ ان دونوں کی ادارت میں 'سہیل' کا صرف ایک شمارہ شاک ہوا۔ یہ شمارہ خاصاً ضخیم، دلکش اور بھرپور تھا۔ اس میں ایک طرف پکا سو سے لے کر چھٹائی تک مشہور مصوروں کی مصوری کے نمونے تھے تو دوسری طرف اصغر، جگر، جوش، اقبال سہیل، اختر النصاری، علامہ اقبال اور اثر لکھنؤی جیسی مشہور

شخصیتوں کی شعری تخلیقات اور تیسری طرف سجاد انصاری، اشفارق حسین، احسن مارہروی، خوبجہ غلام السیدین، اختر انصاری، ابواللیث صدیقی، معین الدین دردائی، سلیم الزماں صدیقی، عبدالستار صدیقی، ذاکر ذاکر حسین، ذاکر اشرف اور سلطان حیدر جوش کی نشری تحریریں۔ اس میں ایک ساتھ مصوری کے میلانات، قومی ادب، اسلامی معاشرت اور اناطول فرانس کے فلسفہ پر مضامین شامل تھے۔ اس رسالہ میں بھی سرور صاحب کی کئی تحریریں شامل تھیں۔ یہ تحریریں تمیں عنادوں کے تحت شائع ہوئی تھیں:

۱ یاد رفتگاں

۲ جبریل مشرق

۳ باب تقید

یاد رفتگاں کے تحت سرور صاحب نے جن شخصیات کا ذکر کیا تھا ان کے نام درج

ذیل میں:

ریاض خیر آبادی، عزیز لکھنؤی، نظم طباطبائی، جگت موبہن لاں روائی، نصیر حسین خیال، آغا حشر کاشمیری اور مولوی ممتاز حسین۔

یہ وفیات مختصر ہیں۔ لیکن ان مختصر وفیات میں بھی سرور صاحب نے ان بزرگوں کے اصل کارناموں کا ذکر کر کے ان کی بنیادی خصوصیات کی نشاندہی کر دی ہے۔ مثال کے طور پر ریاض خیر آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

”آپ اگرچہ اسیر لکھنؤی کے شاگرد تھے مگر دنیاۓ بخن میں داع و بلوئی کے جانشیں بن کر رہے۔“

اسی طرح نظم طباطبائی کے کارناموں کا یہ ذکر دیکھیے جس میں اختصار کے ساتھ تمام تفصیلات آگئی میں:

”آپ صرف ایک خوش گو شاعر ہی نہ تھے بلکہ عربی و فارسی کے جید عالم بھی تھے۔ چنانچہ انسانیات پر کئی رسالے آپ سے یادگار ہیں۔ آپ نے اگر ایک طرف غالب کی شرح لکھ کر اردو پر احسان کیا تو دوسری طرف امرداد قیس جیسے بلند پایہ شاعر کے کلام کی بھی شرح لکھی۔ حیدر آباد کے قیام کے دوران آپ نے کئی مفید ادبی خدمات انجام دیں اور دارالترجمہ کے کام میں بہت کچھ ہاتھ

بنایا۔ گرے کے مشہور مرثیہ کا ترجمہ آپ نے جس خوبی سے کیا تھا اس سے ہر اردو دل واقف ہے۔<sup>۱۰۵</sup>

جبریل مشرق جو اقبال کے دوسرے مجموعہ کلام بال جبریل پر طویل تبصرہ ہے مستقبل کے آل احمد سرور کی تنقیدی صلاحیتوں کا پتہ دیتا ہے۔ سرور صاحب کا مخصوص توازن اور اعتدال یہاں بھی برقرار ہے۔ اس تبصرے کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جو اقبال کی نظم 'جبریل و انہیں' کے بارے میں ہے۔ ان کے خیال میں یہ نظم اس مجموعے کی جان ہے۔ اس کے علاوہ دو اور نظمیں 'مرید ہندی' اور پیر رومی کا مکالمہ اور 'آدم' کا استقبال روح ارضی کی طرف سے، بھی قابل ذکر ہیں۔

باب تنقید کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں اردو ادب کی نمونی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں مختلف کتابوں پر تبصرے ہیں۔ اس حصے میں جو کتابیں زیر بحث آئی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

(۱) سرود زندگی از اصغر گوندوی (۲) شعلہ طور از جگر مراد آبادی (۳) کار امروز از سیما ب اکبر آبادی (۴) نغمہ روح از اختر انصاری (۵) دیوان موسن مرتبہ ضیاء احمد بدایوی (۶) کمال داغ مرتبہ حامد حسن قادری (۷) مسدس حالی از الاطاف حسین حالی (۸) نہیں زمانہ از محبوب حسن صوفی (۹) زندگی از چودھری افضل حق (۱۰) جوش فکر از سلطان حیدر جوش (۱۱) مکتبات نیاز از نیاز فتحپوری (۱۲) لیلی کے خطوط از مجنوں گورکھپوری (۱۳) مجنوں کی ڈائری از مجنوں گورکھپوری (۱۴) آغاز ہستی ترجمہ مجنوں گورکھپوری (۱۵) مجلس مرتبہ احمد شاہ پطرس بخاری (۱۶) تاریخ جمالیات از مجنوں گورکھپوری (۱۷) منشورات از کیفی (۱۸) اصول تعلیم از خواجہ غلام السیدین۔

اس باب کا مقصد بیان کرتے ہوئے سرور صاحب رقم طراز ہیں:

"اس تاریخی تبصرے کا مقصد ایک طرف تو اس سال کی اہم کتابوں کا تذکرہ ہے دوسرے ان رہنمائیات کا تجزیہ مقصود ہے جو ہمارے اس جدید ادب کی گود میں پرورش پار ہے ہیں۔"<sup>۱۰۶</sup>

رہنمائیات والے حصے میں اردو شاعری پر اقبال کے اثر کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے۔

لکھتے ہیں:

"پیامی شاعری بھی اقبال کی تقلید میں شروع ہوئی۔ بعض اچھے شعرا نے یہاں اس نے مقامی رنگ، مقامی الفاظ اور ماحول کی منظرشی کی شکل اختیار کر لی۔ انہوں نے اپنے نغمات سے ساری فضا کو سرشار کیا۔ انہوں نے اپنے اپنے حلقے کی برکات اور نعمتوں کے گھن گائے اور بغیر آورد کے اپنے پڑھنے والوں کے دل میں اس چیز سے محبت پیدا کی۔ بعض حلقوں میں پیامیہ شاعری جدیدیت (ترقی پندی) کی بڑھتی ہوئی رو میں بہگنی اور اس نے ایک بے معنی چیخ اور نہیں کی صورت اختیار کر لی۔ اس زمرے میں وہ تمام کوششیں آتی ہیں جو سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کسان، با غنی و غدار، کی کشاور کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہاں بھی شاعری کم ہے۔ خطابت اور گرج زیادہ۔ ان کا مقصد تحریک ہے۔ صدیوں کی آبیاری اور خون پسینہ ایک کرنے کے بعد جو کچھ تغیر ہوا ہے اسے گرا دینا چاہتے ہیں۔ مگر اس کی جگہ کیا بنا میں گے؟ کون سے بت کی پرستش کریں گے یہ معلوم نہیں۔"<sup>۵</sup>

حیرت ہوتی ہے کہ جس وقت ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز بھی نہیں ہوا تھا سرور صاحب اس کے بنیادی مسائل کی تہہ تک کیسے پہنچ گئے تھے۔ حیرت اس بات پر بھی ہوتی ہے کہ کیا یہ وہی آل احمد سرور ہیں جن کے گھر پر مستقبل میں انہم ترقی پسند مصنفوں کے جلسے ہونے تھے۔

دوسرے حصے میں جہاں کتابوں پر تبصرے ہیں مومن اور داغ کے بارے میں ان کے یہ جملے خاص طور سے قابل ذکر ہیں:

"ندرت اسلوب میں مومن کی برتری مسلم ہے۔ مگر ہمارے خیال میں صدق جذبات میں بہت سے اچھے شعرا ان کے ہم سر ہیں۔"<sup>۶</sup>

"حقیقت یہ ہے کہ داغ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اردو میں حقیقت نگاری کو رواج دیا۔ ان سے پہلے جذبات کا خون کیا جاتا تھا۔ اور حقیقت پر اتنے پردے ڈال دیے جاتے تھے کہ وہ موہومی ہو کر رہ جاتی تھی۔"<sup>۷</sup>

اتنے مختصر الفاظ میں ان دونوں شعرا کی شاعری کی روح کو سمیٹ پانا شاید آج بھی آسان نہیں۔

سرور صاحب کی ان تحریروں سے قطع نظر بھی کر لیں تو پورا رسالہ ان کی خوش سلیقگی

اور مدیرانہ صلاحیتوں کا بہترین مظہر ہے۔

سرور صاحب کی صحافتی خدمات کا تیسرا پڑا مسلم یونیورسٹی گزٹ، علی گڑھ سے ان کی وابستگی ہے۔ ان کی صحافتی زندگی کے اور دوسرے کاموں کے برعکس ان کے اس کام کو کسی طرح ادبی صحافت کے دائرے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ مسلم یونیورسٹی گزٹ دراصل سرید احمد خاں کے ذریعے جاری کردہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا تبدیل شدہ نام ہے۔ سرید کی سائنسیک سوسائٹی کا یہ اخبار جو ۱۸۶۶ء میں جاری ہوا تھا مختلف شکلوں میں بعد تک جاری رہا۔ اور ایم اے او کالج کے یونیورسٹی بن جانے کے بعد ۸ جنوری ۱۹۳۷ء سے اس کا نام بدلت کر مسلم یونیورسٹی گزٹ کر دیا گیا۔ اس کے ایڈیٹر اس وقت مسلم یونیورسٹی کے واکس چانسلر ہوتے تھے۔ اسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے اس پر رحم علی البائی صاحب کا نام چھپتا تھا۔ جون ۱۹۳۷ء میں البائی صاحب نے ایک سال کی چھٹی کی درخواست دی جو قبول کر لی گئی۔ اور ان کی جگہ سرور صاحب کو اعزازی طور پر اسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ لیکن پانچ میونے بعد ہی البائی صاحب نے اپنی چھٹی منسون کرادی اور اپنے کام پر واپس آگئے۔ یوں سرور صاحب ۲۳ جون ۱۹۳۷ء سے ۲۳ نومبر ۱۹۳۷ء تک مسلم یونیورسٹی گزٹ کے معاون مدیر رہے۔

یہ اخبار بیانی طور پر یونیورسٹی کا خبرنامہ تھا جس میں یونیورسٹی کی خبروں کے ساتھ ایک دو منحصر مضمایں بھی شائع ہو جاتے تھے۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ سرید کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے یہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ایک ساتھ شائع ہوتا تھا۔ سرور صاحب اس کے ہر شمارے میں اردو اور انگریزی یا کبھی کبھی صرف اردو یا صرف انگریزی میں اداری لکھتے تھے۔ ان کے ایسے اداریوں یا ادارتی نوٹس کی تعداد ۳۵ تک پہنچتی ہے۔ ان تحریروں کے مصنف کی حیثیت سے کبھی سرور صاحب کا پورا نام چھپا ہوا ملتا ہے کبھی A.A.Suroor، کبھی صرف Suroor یا سرور اور کبھی 'S' یا 'S' ہی لکھا ہوا ہے۔ دو تین تحریریں ایسی ہیں جن پر ان میں سے کچھ کبھی لکھا ہوانہیں ہے۔ ان کا تعین ہم صرف سرور صاحب کے انداز تحریر سے کر سکتے ہیں۔ یا ایک آدھ تحریر کے سلسلہ میں بعض دوسرے حوالے بھی ملتے ہیں۔

سرور صاحب کی صحافتی زندگی کا چوتھا پڑا سہ ماہی 'اردو ادب' ہے۔ یہ انجمان ترقی

اردو (ہند) کا علمی و ادبی رسالہ ہے جو آزادی سے قبل اردو کے نام سے مولوی عبدالحق کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ آزادی کے بعد جب ڈاکٹر ڈاکٹر حسین الجمن کے صدر منتخب ہوئے تو اس رسالہ کا دوبارہ احیا ہوا اور اس کا نام 'اردو ادب' کر دیا گیا۔ یہ رسالہ جولائی ۱۹۵۰ء سے سرور صاحب کی ادارت میں لکھنؤ سے نکنا شروع ہوا اور کم اپریل ۱۹۷۳ء تک ان کی ادارت میں نکتا رہا۔ اس کی خدمت عام طور سے ڈیڑھ سو صفحات کے آس پاس ہوتی تھی۔ اور سال میں اس کے چار شمارے جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے میں عام طور سے تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے تھے۔ لیکن سرور صاحب نے اپنے زمانے میں اس میں تخلیقی نگارشات کو بھی جگہ دینا شروع کیا۔ عام شماروں کے علاوہ سال کے چار شماروں میں سے ایک شمارہ خاص طور سے تخلیقی نگارشات کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء کا چوتھا شمارہ تخلیق نمبر کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ان شماروں میں جمیل مظہری، اختر الایمان، وحید اختر، باقر مہدی، رابی معصوم رضا، سلام مجھلی شہری، قیصر قلندر، اختر انصاری، چودھری محمد نعیم، نیب الرحمن، نشور واحدی، جگن ناتھ آزاد، خلیل الرحمن اعظمی، شاذ تمکنت، سید فضل المتنی، عمیق حنفی، معین احسن جذبی، مسعود علی ذوقی، روشن صدیقی، سلیمان اربیب، شہریار، بشیر بدر، بلال کوہل، شمس الرحمن فاروقی، مشی طہرانی، میکش اکبر آبادی، علی جواد زیدی وغیرہ کی شعری اور اختر اور یونی، قاضی عبد الشفار، رام لعل، راجندر سنگھ بیدمی، کوثر چاند پوری، محمد حسن، اور گور بچن چندان کی نشری تخلیقات شائع ہوئیں۔ ان شماروں کے علاوہ تین اور خصوصی شمارے جواہر ایں نہرو، ڈاکٹر ڈاکٹر حسین اور غالب پر باترتیب ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئے۔ ان تینوں شماروں میں بھی اس زمانے کے بہترین اذبان کی فلکری و فنی کاوشیں شامل تھیں۔

ان خصوصی شماروں کے علاوہ سرور صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والے عام شماروں میں بھی بڑی تعداد میں اہم مصنفوں کی قابل ذکر تحریریں شائع ہوئیں۔ مثال کے طور پر 'لغت اور استعمال عام از رشید حسن خاں، 'مارکسی جماليات' از شفیق نقوی، 'تمامدہ غالب' از مالک رام، 'مثنویات مومن' از ضیاء، بدایونی، 'اردو' کے کوزی تخصصیتے از چودھری محمد نعیم، 'حافظ کا ذہنی ارتقاء' از وارث کرمانی، 'سودا کا ایک قصیدہ؟' از امتیاز علی خاں عرشی،

‘خواجہ میر درد، از شمس الرحمن فاروقی، گوئے از حسن ایم، اب نیا بحیثیت ادیب، از قاسم غنی وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

سرور صاحب کی صحافتی زندگی کا پانچواں پڑاؤ انجمن ترقی اردو (ہند) کا ترجمان ‘ہماری زبان’ ہے۔ سرور صاحب نے اس کی ادارت کی ذمہ داری انجمن ترقی اردو (ہند) کی سکریٹری شپ کے ساتھ ہی ۱۹ جنوری ۱۹۵۶ء کو سنبھالی اور ان کی ادارت میں اس کا آخری شمارہ کیم اپریل ۱۹۷۸ء کو شائع ہوا۔ اس دوران صرف کیم اکتوبر ۱۹۶۹ء سے کیم مئی ۱۹۷۰ء تک ملک سے باہر ہونے کی وجہ سے وہ ہماری زبان اور اردو ادب کی ادارت کے فرائض انجام نہیں دے سکے۔ اس مختصر مدت کو چھوڑ کر لگ بھگ اخبارہ سال وہ اس اخبار کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء میں جب وہ شکا گو یونیورسٹی کی دعوت پر امریکہ جانے لگے تو جانے سے پہلے اپنے ادارے میں انہوں نے لکھا تھا:

”ساز ہے تیرہ برس سے ہماری زبان کے لیے ادارے لکھ رہا ہوں۔ اس طویل عرصہ میں شاید مشکل سے دس بارہ دفعہ ایسا ہوا ہوگا کہ میں کسی طویل سفر کی وجہ سے ہماری زبان کے پڑھنے والوں کے لیے کچھ نہ لکھ سکا ہوں۔ اس عرصہ میں میں نے جو ادارے لکھے ہیں ان میں اردو زبان و ادب کے مسائل کے علاوہ تہذیب، تعلیم، قومی زندگی، علم و فن کے بہت سے پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اہم اشخاص یا واقعات پر بھی رائے زنی کی گئی ہے اور قابل قدر میلانات کی طرف بھی اشارے ہوئے ہیں۔ ان میں یادیں بھی ہیں، خواب بھی، حلق بھی اور فکر و نظر بھی۔ یہ میرے پڑھنے والوں کا کام ہے کہ ان تحریروں کی خوبی یا خامی کا فیصلہ کریں۔ میرا کام تو ان باتوں کی طرف توجہ دلانا ہے جنہیں میں کسی نہ کسی وجہ سے اہمیت دیتا ہوں۔“<sup>۲۴</sup>

امریکہ سے واپسی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ مزید لگ بھگ چار سال وہ پابندی سے یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ انجمن کا یہ اخبار ۲۷ ستمبر ۱۹۵۶ء اسائز پر چھپتا تھا۔ قاضی عبدالغفار صاحب کی ادارت کے زمانے میں یہ پندرہ روزہ روزہ تھا اور اس کے صفحات کی تعداد آٹھ تھی۔ سرور صاحب نے کیم دسمبر ۱۹۵۶ء سے اسے ہفتہ وار کر دیا اور صفحات کی تعداد بھی بڑھا کر آٹھ سے بارہ کر دی۔ کچھ دنوں بعد اسے مزید بڑھا کر بارہ سے سولہ کر دیا۔ لیکن

آخر اجات کے بارے اسے بارہ صفحے پر لانے پر مجبور کر دیا اور کم اپریل ۱۹۶۱ء سے ہماری زبان کے صفحات کی تعداد بارہ ہو گئی۔ بعد ازاں کئی بار اس کے صفحات کی تعداد اور مدت اشاعت میں تبدیلی واقع ہوئی۔ کبھی یہ پندرہ روزہ ہوا تو کبھی ہفت روزہ۔ لیکن ان سب کے باوجود اس اخبار کی مقبولیت برقرار رہی۔ اداریہ کے علاوہ اس میں مختصر مضامین، انجمان کا خبرنامہ، ادھر ادھر سے یا متفرقات، شعری تخلیقات، مراسلات، تبصرے، میرا صفحہ، رفتار یا سخن درخشن کے عنوانیں قائم تھے۔ ان کے صفحات کبھی مخصوص اور متعین ہوتے تھے اور کبھی بدلتے رہتے تھے۔ ان تمام کالموں میں کثرت قابل ذکر تحریریں شائع ہوئیں۔ اردو تحریک سے متعلق تمام خبریں اس کے صفحات پر شائع ہوتی تھیں۔ اس اعتبار سے اسے آزادی کے بعد اردو تحریک کا بڑی حد تک ریکارڈ کہا جاسکتا ہے۔ بہ کثرت اہم کتابوں پر اس میں انتہائی اہم تبصرے شائع ہوئے۔ مراسلات اور مضامین کے حصہ میں بڑی تعداد میں اہم مباحث شائع ہوئے۔ خاص طور سے دیوان غالب کے نو دریافت نسخہ امروہہ یا نسخہ بھوپال یا نسخہ عرشی زادہ کے سلسلہ میں جتنی قیمتی بحثیں ان صفحات پر ہوئی ہیں شاید ہی کسی رسالے کے صفحات کو میسر ہوئی ہوں۔ ’ہماری زبان‘ کے ساتھ اردو ادب، کو بھی سرور صاحب کی زیر ادارت یہ شرف حاصل رہا کہ انھیں لکھنے والوں کی کئی نسلوں کا ایک ساتھ تعاون حاصل رہا۔ رشید احمد صدیقی، امتیاز علی خاں عرشی اور مسعود حسن رضوی ادیب جیسے کہنہ مشقوں کے ساتھ محمد انصار اللہ نظر، کبیر احمد جائسی، شہریار، اصغر عباس اور نیر اقبال صاحب جیسے اس وقت کے نئے قلم کاروں اور خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر، شیم حنفی، اسلوب احمد انصاری اور مسعود حسین خاں جیسے نسبتاً پختہ قلم کاروں کا بھی سرور صاحب کو تعاون حاصل رہا۔ اردو زبان کے مسئلے پر مختلف زبانوں کے کافی تعداد میں ترجمے بھی ہماری زبان کے صفحات میں شائع ہوئے۔ مختلف زبانوں کی شعری تخلیقات کے ترجمے بھی اس کی زینت بنے اور مختلف علمی و ادبی موضوعات پر بڑی تعداد میں اس میں قارئین کے سوالات اور بعد ازاں عالموں کی طرف سے ان کے جوابات بھی شائع ہوئے۔ لکھنے والوں کی مختلف نسلوں کو اس کے صفحات پر اظہار رائے کی پوری آزادی حاصل ہوتی تھی۔ کئی کئی شماروں تک ایک ہی مسئلہ پر بحث جاری رہتی تھی۔ کبھی کبھی یہ گفتگو اتنی تیز، تند اور تلخ ہو جاتی تھی کہ ادارہ کی طرف سے سرور

صاحب کو اسے ختم کرنے کا اعلان کرنا پڑتا تھا۔ یہی نہیں اگر کسی مضمون یا مراحلے کے سلسلہ میں وہ بحث کی ضرورت محسوس کرتے تھے تو اس کے شروع یا آخر میں ادارے کی طرف سے اس سلسلہ میں نوت بھی شائع کرتے تھے۔ مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جمہوری اقدار و روایات کے فروع کا یہ اخبار بہترین پلیٹ فارم ثابت ہوا اور اس نے اس سلسلہ میں قابل ذکر خدمات انجام دیں۔ اس اخبار کا پورا رو یہ بنیادی طور پر وسیع تر قومیت کے نظر یہ پر مبنی تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ چین (۱۹۶۲ء) اور پاکستان (۱۹۶۵ء) کے حملہ کے وقت اس نے ملک کے ان دشمنوں کے خلاف بکثرت تحریریں شائع کیں۔ سرور صاحب نے بھی اپنے کئی اداریوں میں ان حالات پر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ موجودہ ہنگامی حالات اور ادب (اداریہ، ۲۲ دسمبر ۶۲ء) ایک ہوں ہندی وطن کی پاسبانی کے لیے (اداریہ، ۲۲ نومبر ۱۹۶۳ء) پاکستانی جاہیت اور ہمارا فرض (اداریہ، ۸ ستمبر ۱۹۶۵ء) ان میں سے صرف چند ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۲ء کے چینی حملہ کے وقت 'موجودہ ہنگامی حالات اور ادب' کے عنوان سے اپنے اداریہ میں سرور صاحب نے لکھا تھا:

"ہم نے شمشیر انھائی ہے صداقت کے لیے

امن و تہذیب و شرافت کی حفاظت کے لیے

سر بکف آج ہیں ہم ہند کی عزت کے لیے

موجودہ ہنگامی حالات نے ہندوستان کے ہر ادیب کو متاثر کیا ہے۔ اردو کے ادیب بھی متاثر ہیں اور صاف اور واضح الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے ہیں۔ اخباروں اور رسائل میں چین کے خلاف انفرت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اور دنیا کو بتایا جا رہا ہے کہ چین نے ہندوستان کی دوستی کو غمکھا کر اور اس کی سرحدوں پر حملہ کر کے نہ صرف اس کی سالمیت کو محروم کیا ہے بلکہ اس کی عزت اور وقار کو بھی صدمہ پہنچایا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہوتی جا رہی ہے کہ ملک کا بچہ بچہ اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے اپنے جان و مال کی بازی لگانے کو تیار ہے۔ پورے ملک میں اس وقت ایک ایسی وحدت، ایک ایسا عزم، ایک ایسا استعمال اور ایک ایسا جوش و خروش نظر آرہا ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ ہمیں یقین ہے کہ چین کو اس کی بد تیزی کی قرار واقعی سزا ملے

گ۔ وہ ہمارے خلاف اپنے ہاپک ارادوں میں بھی کامیاب نہ ہو سکے گا اور دنیا کی نظر وہ میں بھی ڈالیں ہو جائے گا۔<sup>۹</sup>

یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ سرور صاحب کے مذکورہ نیالات اسی چیز کے خلاف ہیں جسے بھی وہ ہندوستان کے لیے ایک مثال کے طور پر پیش کرتے تھے۔

اسی طرح پاکستانی حملہ کے وقت بھی سرور صاحب نے اپنے اداریہ میں لکھا:

"نہایت افسوس کی بات ہے کہ پاکستان کے حکمران ہندوستان کی امن و واقعیت کی مطلب نمٹ سکھے ہیں اور برابر کوئی نہ کوئی ایسا جنگلہ آگرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف ان دونوں بھروسے ملکوں میں ناچاقی ہو سکتی ہے بلکہ دونوں کی ترقی کے منسوبے جنگلی تیاریوں کی وجہ سے بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ گندمی اور نہروں کا دلیس سب ملکوں سے واقعی کا خواباں ہے اور پاکستان سے تو خاص طور پر وہ اچھے تعلقات رکھنا چاہتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ پاکستان برابر ہندوستان کے خلاف جنگلی تیاریاں کرتا رہا۔ اور اب تو وہ صاف طور پر فائدہ فساد پر اتر آیا ہے۔ ران کچھ میں پاکستان نے بلا وجہ لڑائی شروع کر دی تھی اور ہندوستان کو جوابی کارروائی کرنی پڑی تھی۔ اگر کچھ دوست ملک بیچ میں نہ پڑتے تو ہرے پیلانے پر دونوں ملکوں کے درمیان جنگ شروع ہو سکتی تھی۔ یہ اچھا ہوا کہ ران کچھ کے معاملہ میں سمجھوتہ ہو گیا۔ مگر اس عہد نامے کی روشنائی بھی خشک نہ ہوئی تھی کہ پاکستان نے کشمیر میں مداخلت کر بھیجنے شروع کر دیے۔ اور جب وہاں کے لوگوں نے اور ہماری فوجوں نے پاکستان کی اس چال کو ناکام بنا دیا اور جس راستے سے مداخلت کا ردائل ہوئے تھے اسی راستے کی کچھ چوکیوں پر مجبوراً قبضہ کر لیا تو پاکستان کی فوج نینکوں کے ساتھ کھلم کھلا جنگ ہندی اائن کو پار کر کے ہڑی تعداد میں ہندوستان کی سرحد میں داخل ہو گئی۔ اب تو یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ پاکستان نہ صرف امریکی فوجی امداد کے سہارے ہندوستان سے لڑنا چاہتا ہے بلکہ اسی وجہ سے اس نے ہندوستان کے دشمن چین سے ساز باز کیا ہے کہ وہ ہندوستان کو ہر طرح سے زک پہنچائے۔ پاکستان یہ سمجھتا ہے کہ اس نے مجاہدین کے نام سے جو سپاہی کشمیر کی وادی میں بھیجے ہیں وہ وہاں کے لوگوں کو ورنگانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور پھر پاکستان کی فوج کو آگے بڑھنے کا موقع مل جائے گا۔ مگر کشمیر کے لوگوں نے پاکستان کا منہ توڑ جواب دیا

اور جو گز بڑ پھیلانے اور فساد کرنے آئے تھے وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں منہ چھپائے پھر رہے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ ہندوستانی فوج اور کشمیری عوام ان کا پتہ لگا کر انھیں ختم کر رہے ہیں۔ اب پاکستان نے جموں کے علاقہ میں جو چڑھائی کی ہے اس کا ہندوستانی فوج پوری طاقت سے مقابلہ کر رہی ہے۔ اور جلد ہی پاکستان کو اس کی حمایت کی میزائل جائے گی۔ اس موقع پر اس کا امکان ہے کہ یہ لڑائی اور بڑھے اور اس لیے ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ عام زندگی کے اختلافات کو تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کر کے مختلف طور پر اس خطرے کا مقابلہ کرے اور ایک طرف نیک نیتی، یک جہتی اور امن کی فضای قائم رکھے۔ اور دوسری طرف دشمن کے ہر اقدام کو ناکام بنا دے۔ دراصل پاکستان کی حکومت ہندوستان کے سیکولر نظام کو اپنے وجود کے لیے خطرہ بھیجتی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس سیکولر نظام کو ہر طرح مضبوط کر کیں اور ملک کی سلامتی اور عزت کے لیے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ اس سلسلہ میں اکثریت اور اقلیت، ہندو مسلم، سکھ یا شمال جنوب کا فرق بے معنی ہے۔ اس وقت پورے ہندوستان کو مل کر اس خطرے اور ایسے دوسرے خطروں کا مقابلہ کرنا ہے۔ ہمیں دنیا کو دکھانا ہے کہ ہم امن کے پیاری ہیں مگر ہندوستان کی طرف کوئی بھی نظر بد دیکھے گا تو اس کی مزا بھی بھلکتی پڑے گی۔

پوری صورت حال کا جیسا بھر پور تجزیہ سرور صاحب نے کیا ہے وہ ہر لحاظ سے درجہ اول کی چیز ہے اور کسی بھی اخبار کے لیے قابل فخر ہو سکتا ہے۔

اس قومی رویے کے ساتھ ساتھ سرور صاحب نے 'ہماری زبان' کے صفحات کو میں قومی معاملات و مسائل اور رویوں کے سلسلہ میں اظہار خیال کا ذریعہ بھی بنایا۔ شلوذخوف کے ذریعے نوبل انعام واپس کیے جانے، سمرست مام، آئلڈس بکسلے، لوئی میک نیس، ای ایم فاسٹر، عالمی سطح پر معیاری کتابوں کی اشاعت کا مسئلہ (ایسی بلندی ایسی پستی) وغیرہ موضوعات ان کے اس میں قومی رویے کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ انہوں نے ملک کے اندر جاری ہنگ نظری اور تعصباً کے خلاف بھی 'ہماری زبان' کے صفحات پر احتجاج کیا۔ مثال کے طور پر جب گجرات کے ایک کالج کی اس درخواست کو کہ اسے ہندی کے ساتھ انگریزی میں بھی تعلیم دینے کی اجازت دی جائے حکومت اور یونیورسٹی نے نامنظور

کر دیا تو سرور صاحب نے یہ تنگ نظری کیوں (۸ جون ۱۹۶۲ء) کے عنوان سے اس پر احتجاج کیا۔ اسی طرح انہوں نے آسان ہندی اور ہندی کے ساتھ انگریزی کو باقی رکھنے کے حق میں اسے کیا کہیے (۲۲ جولائی ۱۹۶۲ء) کے عنوان سے اداریہ لکھا۔ اور یہ خیال ظاہر کیا کہ:

”ہندی کی خدمت یہی ہے کہ وہ عام فہم اور مقبول ہو اور سب زبانوں کے الفاظ اس میں کھپ سکیں اور کھپائے جاسکیں۔“<sup>۱۱</sup>

”ہندوستان کی تہذیب فصل کی تہذیب نہیں، صل کی تہذیب ہے۔ وہ ہر اچھی اچھی چیز کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ عالمی عنصر کو خارج نہیں کرتی۔“<sup>۱۲</sup>

یہ اور اس طرح کے دوسرے اداریوں اور تحریروں سے ”ہماری زبان“ کے صفات بھرے پڑے ہیں۔

”ہماری زبان“ کے بعد سرور صاحب کی ادبی صحافت کا چھٹا اور آخری پڑا اور رسالہ ”اقبالیات“ ہے۔ یہ رسالہ انہوں نے اقبال انسٹی ٹیوٹ، سری نگر سے جاری کیا۔ اس کے دو شمارے سرور صاحب کی ادارت میں شائع ہوئے جس کی تفصیل پروفیسر کبیر احمد جائی نے اپنے مقالے ”موس اقبال انسٹی ٹیوٹ — سرور صاحب“ میں پیش کی ہے۔ ان کے مطابق پہلا شمارہ تین حصوں ”اقبال شاعر اور شعريات“، ”تجزیاتی مطالعہ اور متفرقات“ پر مشتمل تھا۔ دوسرے شمارے میں تین مختلف گوشے تھے۔ گوشہ اقبال، گوشہ حسرت اور گوشہ فانی ان دونوں شماروں میں انتہائی بیش قیمت مضمایں شائع ہوئے۔ یہ مضمایں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے مختلف سمیناروں میں پڑھے گئے تھے۔

سرور صاحب کی ادبی صحافت کے یہ تمام نمونے ان کی شخصیت اور ان کے ذہنی اور فکری ارتقا کی ایک پوری داستان کو ظاہر کرتے ہیں۔

## حوالے

- ۱ خواب باقی ہیں، آل احمد سرور، ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۱ء، ص ۳۳۱
- ۲ رسالہ سہیل، ۱۹۳۶ء، مرتبہ رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور
- ۳ ایضاً
- ۴ ایضاً
- ۵ ایضاً
- ۶ ایضاً
- ۷ ایضاً
- ۸ ہماری زبان، علی گڑھ، ۲۲ ستمبر ۱۹۶۹ء
- ۹ ہماری زبان، علی گڑھ، ۲۲ دسمبر ۱۹۶۲ء
- ۱۰ ہماری زبان، علی گڑھ، ۸ ستمبر ۱۹۶۵ء
- ۱۱ ہماری زبان، علی گڑھ، ۲۲ جولائی ۱۹۶۲ء
- ۱۲ ایضاً

## دانشوری

پروفیسر سرور کی دانشوری کو ان کی تنقید سے اور ان کی تنقیدوں کو ان کی دانشوری سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔ جاں ثار اختر کے مجموعہ کلام پچھلے پہر کے پیش لفظ میں ان کے ایک مطلع کے بارے میں سرور صاحب نے لکھا تھا:

”جاں ثار کا ایک مطلع دیکھیے۔“

انقلابوں کی گھری ہے ہر نہیں ہاں سے بڑی ہے  
 اعتراض کرنے والے اس پر لاکھوں اعتراض کر سکتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک یہ  
 شعر غزل کے اسی نئے رجحان کو ظاہر کرتا ہے جو ہر چاؤ کارخانے  
 سے انکار کرتا ہے۔ آج جب ہر طرف لوگ ہاں کہنے میں  
 ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں، نہیں پر یہ اصرار  
 میرے نزدیک ایک مقدس فریضہ ہے۔ اور ایک سچا شعری روایہ۔ ہاں! میں یہ  
 ضرور مانتا ہوں کہ اگر ہر چیز سے انکار کی لے حد سے بڑھی تو پچ شاعر کو پھر  
 سے نرمی سے سمجھانا پڑے گا کہ ہاں کونہ بھول جاؤ۔“

سرور صاحب اس ’ہاں‘ کے دور میں ’نہیں‘ اور ’نہیں‘ کے دور میں ’ہاں‘ کہنے کی صلاحیت کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ وہ بار بار اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ:

”دانشوری نہ صرف انکار کا نام ہے نہ اثبات کا بلکہ دنوں کا۔ جب ہاں کہنے کی  
 لے بڑھ جائے گی تو انکار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور جب انکار کی لے  
 بڑھ جائے تو ’ہاں‘ کہنے کی جرأت کرنی پڑتی ہے۔ فکر روشن اس طرح زندگی  
 میں توازن پیدا کرتی ہے۔ اور ادھر یا ادھر میں اسیر ہونے سے بچاتی ہے۔ میں  
 تو دانشوری کو ڈھنی توازن کا دوسرا نام سمجھتا ہوں۔“

اپنی ایک نظم میں بھی انہوں نے یہ بات کہی ہے۔ نظم کا عنوان ہے ’تم کیسے شاعر ہو؟‘ کہتے  
 ہیں۔

تم شاعر تھے، ادیب تھے، دانشور تھے  
 تمہاری پرواز دھرتی سے آسمان تک تھی  
 تمہارے پنکھے پورب سے پچھم تک پھیلے ہوئے تھے  
 تم جو محسوس کرتے تھے کہتے تھے  
 تمہارے لفظوں میں تمہاری روح کا نغمہ تھا  
 تم بہاروں کا سارا بانکپن  
 خزاں کے زخموں کی ساری کک  
 دن کی ساری دھوپ  
 اور رات کا سارا جادو چھوڑ کر  
 ایک شہرے پنجھرے کے افق میں کیوں کھو گئے  
 شاعر ایک پڑی ایک لکیر پر نہیں چلتا  
 درباروں کے ماحول میں اس کا دم گھٹتا ہے  
 وہ بیان نہیں دیتا، وزن دیتا ہے  
 وہ دوسروں کی نہیں، اپنے من کی بات کہتا ہے  
 وہ دوست ہے، ساتھی ہے، غم خوار ہے، چارہ گر ہے  
 وہ افسر نہیں

نہ شہہ کا مصاحب ہے  
 بتاؤ تم کیسے شاعر ہو؟  
 کیسے ادیب، کیسے دانشور ہو؟  
 تم تو اب صرف ہاں کہتے ہو  
 نہیں، کہنے کی ہمت کہاں گئی؟  
 شاعر تو ہاں بھی کہتا ہے نہیں بھی  
 جب ہاں کا شعور بڑھ جائے  
 تو کوئی نہیں تو کہے

اور جب نہیں کا زور ہو

تو کسی کی بآ بھی نکے  
شاعر بول کے لیبل سے مت نہیں ہوتا

اس کی مستقیمی کام و دہن سے عبارت ہے

دانشوری کی اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ آندرے مارلو کی دیگال کی حکومت میں شمولیت پر سارتر کے اس جملہ کا بار بار حوالہ دیتے ہیں کہ :

”دانشور کو حکومت کا پرزا نہیں ہونا چاہیے۔ اسے باہر سے حکومت کی مدد کرنی چاہیے۔ اور اگر حکومت غلطی کرے تو اسے نوکنا چاہیے۔“<sup>۱۲</sup>

وہ دانش وری کو ایک ذاتی صلاحیت سے تعبیر کرتے ہیں جو جذبے یا احساس کے بجائے عقل کو اپنا رہبر بناتی ہے۔ وہ دانش ور کے لیے ایک ایسا مرتب اور منظم ذہن ضروری سمجھتے ہیں جو زندگی میں تنظیم کر سکتا اور بنیادی اور فروعی باتوں میں فرق کر سکتا ہو۔ وہ ماہر سماجیات شولز کی دانشور کی تعریف سے اختلاف کرتے ہوئے ہر دماغی کام کرنے والے کو دانشور مانتے ہیں۔ وہ دانش وری کے لیے روشن خیالی کو ضروری قرار دیتے ہیں اور عمل کو بھی۔ ان کے الفاظ میں :

”دانش وری روشن خیالی کا دوسرا نام ہے۔ یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ دانشور صرف نظری معاملات سے سروکار رکھتا ہے۔ عمل کی دنیا سے اس کا کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ یا یہ کہ ہ صرف قلم کا مردمیدان ہے۔ عملی آدمی نہیں۔ چیزیں دانشوری علم اور عقل کو رہنمایا ہتی ہے اور اس علم و عقل کو عملی معاملات میں برقراری ہے۔ یہ جذبے اور احساس سے عاری نہیں ہوتی۔ جذبے اور احساس کو اگام دیتی ہے اور اس کی طاقت سے بھی کام لیتی ہے۔ مگر اس کے بیجا استعمال پر روک لگاتی ہے۔ اسے ’ہے’ سے ’چاہیے‘ تک لے جاتی ہے۔ اسے انسانی تہذیب، اخلاقی معیار، سماجی نصب اعین عطا کرتی ہے۔ دانشوری آدمی کو انسان بنانے کا دوسرا نام ہے۔ یہ گذری ہوئی دنیا کی معنویت، حال کی افراتفری میں صلاحت اور مستقبل کے دھنڈکوں میں روشنی کی کر نیں تلاش کرتی ہے۔ دانشوری کی کوئی مسلسل روایت ہی سماج کی ذاتی صلاحیت، علمی معیار اور بالآخر ترقی کی پہچان ہے۔“<sup>۱۳</sup>

ان کے خیال میں دانشوری عام طور سے اقتدار سے دور ہی بھلی پھولتی ہے۔ باوجود یہ کچھ دانشور اقتدار کے سائے میں بھی رہے ہیں لیکن اقتدار سب سے پہلے اس تشکیل کو، اس بے اطمینانی کو، اس باغیانہ لے اور انقلابی فکر کو ختم کر دیتا ہے جو دانشوری کی بنیاد ہے۔ اقتدار سب سے پہلے سکون و اطمینان پیدا کرتا ہے۔ اسے سوالیہ نشان پسند نہیں۔ اور دانشور کے پاس جواب ہو یا نہیں سوال ضرور ہوتا ہے۔ اس کا ذہن سوالات کا خزانہ ہوتا ہے۔ یہ سوالات مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں۔ کائنات کے بارے میں ہو سکتے ہیں، خالق کائنات کے بارے میں ہو سکتے ہیں، نظام کائنات کے بارے میں ہو سکتے ہیں، سماج اور معاشرہ کے بارے میں ہو سکتے ہیں، خود اپنے بارے میں ہو سکتے ہیں، سیاسی نظام کے بارے میں ہو سکتے ہیں، اقتصادی نظام کے بارے میں ہو سکتے ہیں، تعلیم کے بارے میں ہو سکتے ہیں، تہذیب کے بارے میں ہو سکتے ہیں۔ کبھی کبھی دانشور کے پاس ان سوالات کے جوابات ہوتے ہیں اور کبھی نہیں ہوتے۔ کبھی وہ ذہن کو اکسرا کر چھوڑ دیتا ہے، سوچنے کے لیے مجبور کر دیتا ہے کہ یہ بھی ایک بڑا کام ہے۔

جو دانش درجنے والے بنیادی مسائل سے جو جھٹا ہے وہ اتنا ہی بڑا دانشور ہوتا ہے۔ اسی دانشوری کی الگی سطحِ فکر کی ہے جو ان تمام سوالات اور جوابات کو ایک نظام کا حصہ بنانے پاتا ہے، ایک نئی عمارت کی تغیری کر پاتا ہے، ایک نئی سوق، نیا رخ دے پاتا اور اس کے تمام پست و بلند پر نظر رکھتا ہے۔ آل احمد سرور اس اعتبار سے ایک اہم دانشور ہیں۔ وہ زندگی، کائنات، قوم، ملک، ملت سب کے بنیادی مسائل پر غور کرتے ہیں۔ اس غور و فکر میں کبھی کبھی ان کا جھکاؤ مارکسی نقطہ نظر کی طرف بھی ہو جاتا ہے، لیکن مارکسیت کے معنی وہ اندھیت کے نہیں لیتے ہیں بلکہ ایک سامنی نقطہ نظر کے لیتے ہیں۔ ان کے مطابق:

”مارکسی نظریہ دراصل ایک متوازن نظریہ ہے۔ یہ تاریخ اور سامنہ دونوں کا امتحان ہے۔“<sup>۵</sup>

ایسی لیے وہ سماجی فلاج کے لیے روس اور چین کے نظام کی طرف دیکھتے ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کو کھلی چھوٹ دینے کے خلاف ہیں:

”ہندوستان کی زندگی میں طویل عرصہ کے لیے محض معیار زندگی بڑھانے اور

ملک کی دولت میں اضافہ کرنے کے سبب اسے پر سرمایہ داری کو سادہ چیک نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ ایسے معاشی نظام کو قریب لانے کے لیے جدوجہد لازمی ہے جو دنیا کی ترقی کی رفتار کے ساتھ ملکی خصوصیات کو ہر قرار رکھ سکے۔ اس سلسلہ میں چین کی مثال مشعل راہ بن سکتی ہے۔ چین اور ہندوستان میں بہت آئی باتیں مشترک ہیں۔ سماجی فلاح کے لیے چین اور روس کے سوا اور کہیں کا نظام اس قدر رہنمائی نہیں کر سکتا۔<sup>۱۷</sup>

لیکن چین یا روس کے نظام کو بھی وہ من و عن قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ گاندھی جی کی اس بات کے قابل نظر آتے ہیں کہ ان ملکوں میں جو نظام ہے وہ ان کے مزان کے مطابق ہے۔ ہمیں ایسا نظام چاہیے جو ہماری ضروریات کے لیے موزوں ہو۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

”اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ مغربی یا البرل جمہوریت بخوبی ہمارے حالات کے لیے موزوں نہیں ہے۔ مگر اس کے معنی نہ تو جمہوریت سے انکار کے ہیں، نہ روس یا چین کی گورانہ تغیری کے، نہ آمریت یا فوجی حکومت کی حمایت کے اور نہ ہنگامی حالات کے لفڑا کو سراہنے کے۔“<sup>۱۸</sup>

وہ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی عظمت کے دل سے قابل ہیں اور ان کے کارناموں کا ذکر کرتے نہیں تھکتے۔ ان کی موت پر ”ہماری زبان“ کے نیم جون ۱۹۶۳ء کے شمارے میں انہوں نے ”مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداں ہے“ کے عنوان سے جو اداریہ لکھا تھا وہ اس کا بہترین ثبوت ہے۔ اس کے یہ الفاظ آج بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں کہ:

”یوں تو جواہر لال نہرو نے ہندوستان کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اس کی تفصیل ایک دفتر چاہتی ہے۔ مگر ان کا سب سے بڑا عظیم یہ ہے کہ انہوں نے با معنی اور با مقصد زندگی کا مفہوم آمجھایا۔ ہندوستان میں کوئی ایسا نام ذہن میں نہیں آتا جو جواہر لال نہرو کی طرح اپنی زندگی کو ایک اعلیٰ مقصد اور مشن کے لیے وقف کرنے کا ہو۔ جواہر لال نہرو نے آزادی کو معنی و مقصد عطا کیا۔ منصوبہ بندی کا ایک کمیشن بنایا، اور مستقبل کا ایک ڈھانچہ تیار کیا۔ جمہوریت، غیر مذہبی ریاست، اور سو شلزم کے تصور کو جواہر لال نہرو نے نہ صرف زبان سے منوا بملک دلوں میں بخھایا۔“<sup>۱۹</sup>

۱۹۶۳ء کا یہ تاثر مخصوص ایک وقتی اور جذبائی تاثر نہیں تھا۔ انہارہ سال بعد ۱۹۸۲ء میں جب انہوں نے سیدین میموریل لکچر دیا تو اس وقت بھی وہ اس بات کا ذکر کرنا نہیں بھولے کہ ”انہوں نے بڑی طاقتون کا دامن پکڑنے کے بجائے نادابستگی کا راستہ دکھایا۔“

آج تیسری دنیا کا تصور بڑی حد تک ان کی کوششوں کا مرہون منت ہے۔<sup>۹</sup>

”انہوں نے نہ صرف سائنس پر زور دیا اور سائنسی مزاج کی تبلیغ کی بلکہ قومی تجربہ گاؤں کا ایک جال بچھا دیا جس کی وجہ سے ہمارے پاس سائنس دانوں اور ماہرین فن کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔“<sup>۱۰</sup>

لیکن ان سب کے باوجود وہ بعض معاملات میں ان کے ایک رخے پن کو نظر انداز نہیں کرتے جس کی وجہ سے جدید ہندوستان کے موجودہ نقشے میں ٹھیک سے رنگ نہیں بھرا جاسکا۔ سرور صاحب کے خیال میں:

”پہلی غلطی تو یہ کہ انہوں نے گاندھی جی کے جانشیں ہونے کے باوجود گاندھی جی کے De-Centralization اور درمیانی نکنالوجی اور دیہات کی اکائیوں کی بنیاد پر نظام حکومت کی تعمیر کے تصور کو یکسر نظر انداز کیا۔ دوسرے انہوں نے بیورڈ کریسی کے اس ڈھانچے کو جو انگریزوں سے ملا تھا ویسے ہی قائم رکھا۔ اور ان کی حب وطن کو فرض کر لیا۔ تیسرا وہ دنیا کے درد میں ایسے بتا ہوئے کہ چراغ رہمندر بن گئے۔ ہمارے جمہوری نظام کو تمام تر مغربی جمہوریتوں کے مطابق بنانے میں غلطی ہے۔“<sup>۱۱</sup>

ان کے خیال میں ہمیں جدید کاری Modernization اور مغربیت Westernization میں فرق کرنا چاہیے۔ ہمارے رہنماؤں سے غلطی یہیں ہوئی کہ انہوں نے جدید کاری کو مغربیت کا مترادف سمجھ لیا۔ اور مغرب کے اداروں کو اپنے یہاں بغیر کسی تبدیلی کے رانج کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے بی کے نہرو کے الفاظ میں اپنی بات اس طرح کہی ہے کہ ”ہمیں ایسے جمہوری نظام کو نافذ کرنا چاہیے جو ہماری ضروریات کے مطابق ہو۔“<sup>۱۲</sup>

”مغربی جمہوریت یا لبرل جمہوریت خصوصاً اس کا برطانوی ماذل ہمارے حالات کے لیے موزوں نہیں ہے... چونکہ مشرق میں نشۃ الثانی، عقلیت کے فروغ، رواداری اور مساوات کے تصورات عام ہونے اور جمہوری اداروں کی

روایت قائم ہونے کے موقع پیدا نہیں ہوئے اس لیے مغربی جمہوریت کا ماذل  
بجھ سے ہمارے کام نہیں آ سکتا۔ ۲۳

موجودہ نظام حکومت میں وہ ریاست اور مرکز دونوں سطح پر دو دو محاسن کو ضروری نہیں  
سمجھتے۔ مرکز میں پارلیمنٹ کی ایک مجلس یعنی لوک سجا کافی ہے۔ راجیہ سجا کی کوئی  
ضرورت نہیں۔ اسی طرح ریاستی سطح پر بھی قانون ساز ایمبیلی کافی ہے۔ کاؤنسل کی ضرورت  
نہیں۔ ان کے خیال میں یہ چیزیں محض عیاشی ہیں۔ وہ راشرپتی بھومن اور راج بھومن کی  
ظاہری شان و شوکت کو بھی غیر ضروری فرار دیتے اور اسے برطانوی عہد کی یادگار سمجھتے ہیں۔  
ان کے خیال میں ان پر اتنا روپیہ خرچ کرنا اور ان کو اتنی اہمیت دینا غیر ضروری ہے۔ اور  
صدر کے انتخاب میں پنجاہیت سے لے کر پارلیمنٹ تک کے نمائندوں کو شریک ہونا چاہیے  
اور صدر کو یہ اختیار دینا چاہیے کہ اگر وہ کسی قانون سے اتفاق نہ کرتا ہو تو اس پر عدالت کی  
بھی رائے طلب کر سکے۔

ظاہر ہے یہ باتیں انتہائی اہم اور توجہ طلب ہیں۔ ان پر قومی سطح پر گفتگو ہونی چاہیے  
اور اس کے ثابت و منفی پہلوؤں پر غور کر کے ایک رائے قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔  
اگر ممکن ہو تو اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ یہ بات کبھی جا سکتی ہے کہ  
راجیہ سجا اور قانون ساز کاؤنسل کو ختم کر دینے کی صورت میں ادیبوں، فنکاروں اور دانشوروں  
کی جو نمائندگی حکومت میں ہوتی ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ اس کے جواب میں یہ بات بھی  
کبھی جا سکتی ہے کہ یہ ادیب، فنکار اور دانشور عوام کے ذریعے منتخب ہو کر آ سکتے ہیں۔ ان کے  
عوام میں جانے اور انتخاب میں حصہ لینے کا سب سے بڑا اور سامنے کا فائدہ تو یہ ہو گا کہ  
سیاست کا Stereotype ختم ہو گا۔ سستی سیاست کم ہو گی۔ اسے کچھ وقار ملے گا۔ ہمارے  
ادیب، فنکار اور دانشور عوام کی زندگی کی بنیادی حقیقوں سے جزویں گے۔ ان بکے دکھ درد  
سے واقف ہوں گے۔ ہاتھی کے دانت کے میناروں میں بینچ کر خواب نہیں دیکھیں گے۔  
اپنے خوابوں کو حقیقت کی تعبیر بھی دیں گے۔ اگر کوئی ادیب، فنکار اور دانشور عوام کی نیض پر  
انگلیاں نہیں رکھ سکتا ہے تو نہ وہ سچا ادیب ہو سکتا ہے، نہ فنکار، نہ دانشور۔ پھر ایسے شخص کی  
ان اداروں میں کیا ضرورت ہے؟ اقتصادی نقطہ نظر سے دیکھیں تو بھی ان اداروں کے ختم

کیے جانے سے ملک کی عوام پر ہٹنے والا کروڑوں روپے کا مالی بوجھ کم ہو سکتا ہے۔ یہ بات اس لیے بھی اہم ہے کہ آج سیاست صرف اپنے ظاہری معنی تک محدود نہیں رہ گئی ہے۔ پروفیسر سرور کے الفاظ میں:

”ہمارے یہاں سیاست کے بہت محدود اور غلط معنی لیے گئے ہیں۔ ہم نے حکومت کے نظم و نت، ایکشن، جلسے اور جلوس، اقتدار سے جنگ اور استبداد کے خلاف آواز کو سیاست سمجھ رکھا ہے۔ اس لیے اسے ایک گندی چیز سمجھ کر ادب جیسے مقدس انسان کو اس سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ سیاست ہماری زندگی کے سارے نظام پر محیط ہے۔ موجودہ دور میں اب یہ احساس ہوتا جا رہا ہے کہ سیاست اقتصادیات کا دوسرا نام ہے۔ یہ قول بڑی حد تک صحیح ہے مگر اچھی سیاست صرف پیداوار کے ذرائع اور تقسیم پر ہی غور نہیں کرتی۔ وہ انسانوں کے جذبات و خواہشات، ان کے خوابوں اور خیالوں کی بھی نیاض ہوتی ہے۔“<sup>۱۵</sup>

ان کے خیال میں ہندوستانیت ہندو اسلام کے متراویں نہیں ہے۔ اس لیے ہندی، ہندو، ہندوستان کا نعرہ نہ صرف غلط بلکہ ہندوستانیت کے لیے سم قاتل ہے۔ وہ ہندوستانیت کو کسی ایک دھارے تک محدود نہیں کرتے۔ ان کے الفاظ میں:

”کچھ لوگ جب مسلمانوں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ قومی دھارے میں شامل ہو جائیں تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ہندو تہذیب اختیار کر لیں۔ حالانکہ ہمارا قومی دھارا ایک نہیں اس میں کئی دھاراؤں کا ملاب ہوا ہے اور ہندوستانیت جنوبی مشرقی ایشیا، جنوبی ایشیا اور وسطی اور مغربی ایشیا تینوں دھارے سے بنی ہے اگر اس اہم نکتے کو ذہن میں رکھا جائے تو ہر عنصر کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اور معاملہ یک گیر و محکم گیر کا نہیں ہے گیر و ہم رنگ ہونے کا ہے جس کی اپنی طاقت واضح ہے۔“<sup>۱۶</sup>

”اقليتوں سے یہ اصرار کہ وہ اپنی تاریخ کو بھول جائیں، اپنے مذہبی، علمی اور تہذیبی سرمائے کو نظر انداز کر دیں اور اکثریت کے سرمائے کو دل و جان سے قبول کر لیں قطعاً غلط ہے۔“<sup>۱۷</sup>

وہ ابوالکلام آزاد کے رام گڑھ کے خطبے کے الفاظ اور اس کی بنیادی روح سے اتفاق کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کو اپنی تہذیبی و راثت کے کسی حصہ سے دست بردار

ہوئے بغیر قومی زندگی کے فرائض کو ادا کرنے سے کوئی چیز روکنے والی نہیں ہے۔ اور ان دونوں میں تضاد کی کوئی صورت نہیں ہے۔ دونوں چیزوں ساتھ ساتھ چل سکتی ہیں۔ اسی لیے وہ قومیت کے محدود تصور کو رد کرتے ہوئے اس کے نتائج سے بھی باخبر کرتے نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

"بعض لوگ صدیوں پرانی تہذیب کو واپس لانا چاہتے ہیں۔ وہ یہ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ایسا کرنا صدیوں کی ترقی کو نظر انداز کر دینا ہے۔ ہندوستان میں دو ہزار سال یا پاکستان میں تیرہ سو سال پہلے کی تہذیب کو اول تو نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے ایک حد تک چند اوپری باتیں لی جاسکتی ہیں۔ اس تہذیب کو زندہ نہیں کیا جاسکتا جو وقہ گزر گیا ہے اور فاصلہ پیدا ہو گیا ہے اسے غائب نہیں کیا جاسکتا۔ لوگ چند قدم پیچھے ہٹ سکتے ہیں، پیچھے کی طرف جست نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانیت کی تاریخ میں قومیں اب علیحدہ اور آزاد اس طرح نہیں ہیں جس طرح پہلے تھیں۔ موجودہ ترقی کی رفتار سے علیحدہ ہو کر قومیں کچھ دن تک سانس تو لے سکتی ہیں مگر صحیح معنی میں زندہ نہیں رہ سکتیں۔ جاگیرداری کے تصور کو دوبارہ نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ نہ یہ ممکن ہے کہ سو شلزم یا سرمایہ داری کے چند مظاہر لے کر جاگیرداری کی مردہ الاش میں جان ڈالی جائے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہندوستان اپنی تہذیبی قدروں کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ میں الاقوامیت کا صحیح تصور جیسا کہ اراؤں نے کہا ہے قومیت کے کھنڈر پر نہیں بلکہ اس کی اینٹوں پر بنایا جاسکتا ہے۔ دنیا کے تالفے کے ساتھ جانے کے لیے اپنی راہیں تلاش کرنی پڑتی ہیں۔ اس لیے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے بعض عناصر کو خارج کرنے کی کوشش اور زبان، ادب کو قدیم سانچے میں ڈھالنے کی کوشش ایک فریب کے پیچھے حقیقت سے منہ موڑ لینے کے متراوٹ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ کوشش خود ہی تاکام ہو جائے گی اس لیے اس کی غلطی کو سمجھ لینا کافی ہے۔ اس سے آپ ہندوستان کو دنیا کی ترقی کی دوڑ سے علیحدہ کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح ہندوستان کو تقابل تباہی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس لیے اس نظریے کے خلاف عملی جدوجہد کرنا ضروری ہے۔" ۱۷

اگر یہ بات ذہن میں رکھیں کہ سرور صاحب نے یہ باتیں ۱۹۵۰ء میں کبھی تھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مستقبل کے ہندوستان کے نقشوں پر ابھرنے والی تحریکوں اور ان سے پیدا ہونے

والے مسائل و معاملات کا کتنا واضح تصور رکھتے تھے۔ پچاس سال سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے بعد آج ہم جو باتیں محسوس کر رہے اور کہہ رہے ہیں سرور صاحب نے اسے پچاس سال پہلے محسوس کر لیا اور تصور کی آنکھ سے دیکھ لیا تھا۔

پروفیسر سرور نہ صرف قومیت کے اس تصور سے انکار کرتے ہیں جو جغرافیائی حد بندیوں پر اصرار کرتا ہے بلکہ اس تصور سے بھی انکار کرتے ہیں جو قومیت کی بنیاد مذہب کو قرار دیتا ہے۔ ان کے خیال میں ”عرب عیسائی اور عرب یہودی باوجود اس کے کہ عرب مسلمانوں سے مختلف مذہب رکھتے ہیں مگر ان کے ساتھ ایک عرب قوم کا جز ہیں۔“<sup>۱۸</sup> اسی طرح ”ہندوستان کے ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، سکھ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہوئے ہندوستانی قوم کے افراد ہیں۔“<sup>۱۹</sup> ان کے خیال میں ہم سب ہندوستانی ایک قوم ہیں لیکن Monolithic قوم ہونے کے بجائے کثیر جوہر یا Pluralistic قوم ہیں اور اس کے ہر جوہر پر اصرار کرنا چاہیے۔

انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں پر ہونے والے اس اعتراض کا بھی ذکر کیا ہے کہ انھوں نے ملکی مسائل سے کم سرور کار رکھا اور عالم اسلام کے مسائل سے زیادہ۔ اور لکھا ہے کہ:

”اس قول میں میرے نزدیک کچھ صداقت ضرور ہے۔ عالم اسلام سے ہم اتعلق نہیں ہو سکتے۔ ہمارا روحانی مرکز بہر حال مکہ ہے اور ہمارے عشق کا مدینہ۔ مگر اس کے یہ معنی کیسے ہو گئے کہ ہمیں گھر کے معاملات سے اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں سے، اپنی تہذیب اور اپنے سماج سے کوئی واسطہ نہیں۔ قومی مسائل سے ملحدگی یا ایقلتی اس کی صلاح و فلاح سے بے نیاز ہی اور ساحل سے دریا کی موجودوں کے زیر و بم کا تماشا دیکھنا، اپنی ڈیڑھ ایسٹ کی مسجد الگ بنانا میرے نزدیک نہ صرف قومی نقطہ نظر سے بہت بڑی کوتاہی ہے بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے بھی۔“<sup>۲۰</sup>

انھوں نے مسلمانوں کی قیادت میں علماء کے رول اور اس کی وجہ سے جدیدیت سے مسلمانوں کی دوری کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے خیال میں ”ان کی (مسلمانوں کی) قیادت ان علماء کے ہاتھ میں رہی جو انگریز اور اس کی

لائی ہوئی ہر چیز کی مخالفت ایک مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی کمزوری یہ رہی ہے کہ انہوں نے جدید دور کو عرصہ دراز تک دل سے قبول نہیں کیا۔ مسلمانوں کو علماء نے جدید دور کے خیر مقدم اور اس میں اپنا مقام متعین رنے سے باز رکھا۔ انہوں نے اپنے نزدیک شریعت کی حفاظت کو سب کچھ سمجھا۔ اسلام کے حرکی پیام، اس کی ہر دور میں نئے حقائق کو قبول کر کے نئے مرے سے زندگی کی تنظیم کرنے کی صلاحیت اور دنیا کی کیجیتی سے آخرت کے لیے نئے نئے حاصل بہم پہنچانے کی استعداد کو بھول گئے۔<sup>۲۱</sup>

انہوں نے عالمی سطح پر بھی مسلم ممالک کے رول پر سوالیہ نشان قائم کیا ہے۔ ان کے مطابق: ”دوسری جنگ عظیم کے بعد تیل کے بڑے ذخیروں کی دریافت اور ان کو زمین کی تہہ سے نکلنے کی وجہ سے مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے مسلم ممالک بڑے مالدار ہو گئے اور اس کے اثر سے عالم اسلامی میں ایک نئی زندگی نظر آتی ہے جس سے بعض لوگوں نے بڑی بڑی توقعات قائم کر رکھی ہیں۔ مگر کیا ان ممالک میں علوم اور سائنس کو وہ فروغ ہوا ہے جس کے بغیر ترقی کا تصور بے معنی ہے۔ کیا ان کی زندگی زیادہ اسلامی ہو گئی ہے؟ کیا یہاں کے عوام ترقی یافتہ ممالک کے عوام میں معيار تک پہنچ سکے ہیں؟ کیا کائنات کی تنجیر یا خلائی تنجیر میں ان کا کوئی اہم حصہ ہے؟ کیا انہوں نے موزی امراض کے دفع کرنے کے لیے کوئی قیمتی دوا ایجاد کی ہے؟<sup>۲۲</sup>

انہوں نے علماء کے ساتھ ساتھ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور اس طبقہ کی خود غرضی کو بے نقاب کیا ہے:

”علماء نے تو خیر ہماری ہنی قیادت کا فرض اس لیے انجام نہیں دیا کہ وہ بسم اللہ کے گنبد میں گرفتار ہے اور موجودہ دور اور اس کے تقاضوں کو انہوں نے پرکاہ سے زیادہ وقوع نہ دی۔ مگر کیا ہمارا نیا تعلیم یافتہ طبقہ، ہمارے تعلیمی اداروں کے استاد، ہمارے سرکاری ملازم، ہمارے سیاست داں، ہمارے تاجر اور ہمارے دست کا اپنا فرض پہنچانے ہیں؟ کیا وہ صرف اپنا گھر بھرنے، اپنے در و بام کی آرائش و زیبائش کرنے، اپنے خانہ باغ کو سجائے، دولت جمع کرنے اور اس کے ذریعے سے اپنے عیش و آرام کا سامان فراہم کرنے میں مصروف نہیں رہے؟ علماء کا تعلق تو بہر حال عوام سے اب بھی ہے اور یہ ایک حد تک ان کی

فلاح کے لیے مساعی بھی کر رہے ہیں لیکن یہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ صرف اپنی خدمت کرتا ہے۔ اپنا گھر بھرتا ہے۔ اپنی جنت پکی کرنا چاہتا ہے۔ ہم علماء کے کمزپن پر بجا طور پر ماتم کرتے رہے ہیں لیکن ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں جو نئی کٹھ ملائیت آگئی ہے اس کا احساس کیوں نہیں؟ یہ سطحی علم پر اتراتا ہے۔ یہ جزویات کا ماہر ہے۔ کل سے واسطہ نہیں رکھتا۔ اس کا مطالعہ محدود اور علم مانگے کا ہے۔“<sup>۲۳</sup>

وہ اس بات پر خاص طور سے توجہ دیتے ہیں کہ:

”ہر طرف نئی نئی مسجدیں تو وجود میں آ رہی ہیں مگر نئے صنعتی اسکول کم کھل رہے ہیں۔ اب بھی مرجب تعلیم کے لیے مدارس کی تعداد کم ہے۔ علوم میں نئے نئے افق اور نئی نئی فضائیں ہمیں بلا رہی ہیں مگر ہم نے ابھی Conventional مرجب علوم کا اکتساب بھی نہیں کیا۔“<sup>۲۴</sup>

سرور صاحب کے یہاں تاریخی ارتقا کا بہت واضح تصور ملتا ہے۔ اس کی بنیادی صفت وہ سادگی سے پیچیدگی کی طرف سفر کو قرار دیتے ہیں۔ اسی لیے ان کے ادبی اور تنقیدی مضامین میں بھی ۱۸۵۷ء، ۱۹۱۳ء اور ۱۹۳۷ء جیسی اہم تاریخوں کا بار بار حوالہ ملتا ہے۔ وہ مارکس کی اس بات کے بھی قائل ہیں کہ برطانوی سامراج نے ہندوستان کو عہد سلطی کی ذہنیت سے عہد جدید میں لانے کے لیے ایک تاریخ کے ایجنسٹ کا کام کیا۔ اس ارتقا اور اس کی زائدہ پیچیدگی کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

”کچھ لوگ اسے کتنا ہی برا کہیں لیکن فطرت کا غائزہ مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ پیچیدگی بھی فطرت اور ارتقا کا ایک مطالعہ ہے۔ اس لیے اس پیچیدگی کا ماتم کرنے کے بجائے اسے تسلیم کرنا چاہیے۔ غور سے دیکھا جائے تو اس پیچیدگی اور الجھاؤ میں ہمیں چند واضح رجحانات ملتے ہیں۔ یہ رجحانات اتفاقی نہیں ہیں بلکہ کائنات کے ارتقا سے قدرتی طور پر پیدا ہوئے ہیں۔ یہ رجحانات اتنے قوی ہیں کہ کوئی بھی انسانیت کا سوراخ انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ان میں سب سے اہم ترقی کا رجحان ہے، انسانیت ترقی کر رہی ہے۔ یہ ترقی ابتدا سے ظہور میں آتی رہی ہے۔ اگرچہ ہر دور میں اس کی رفتار یکساں نہیں رہی۔ ترقی کسی سیدھے سادے خط کی طرح مستقیم نہیں ہے، اور نہ ہر ترقی کے

بعد تنزل کی کوئی مقررہ صورت ہے۔ فطرت، نامیاتی دنیا اور انسان تینوں میں ہمیں ترقی کی عام رفتار ملتی ہے۔ اگرچہ بعض اتفاقی حادثے اس رفتار کو سست کر دیتے ہی یا تحوزی دیر کے لیے زائل کر دیتے ہیں۔<sup>۲۵</sup>

تعلیم کا تصور اور تعلیمی صورت حال خاص طور پر سرور صاحب کے مطالعات کا موضوع رہے ہیں اور مختلف جگہوں پر انہوں نے اس سلسلہ میں اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے خیال میں بنیادی تعلیم ہمیشہ صرف اور صرف مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ انگریزی کو اعلیٰ سطح پر لازمی طور پر پڑھانا چاہیے اور ثانوی منزل کی سطح پر دیگر مضامین کے ساتھ ایک علاقوائی یا سرکاری زبان کو جو مادری نہ ہو۔ ان کے خیال میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم سب کے لیے ہونی چاہیے۔ لیکن اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا اختیار سب کو نہیں دیا جاسکتا۔ تعلیم کا مقصد شخصیت کی تعمیر و تشكیل ہونا چاہیے۔ ذگری دینا نہیں۔ ان کے خیال میں سماجی علوم اور انسانی علوم کے طلبہ کے لیے سائنس کا کوئی بنیادی کورس اور سائنس کے طلبہ کے لیے انسانی علوم اور سماجی علوم کا کوئی ابتدائی کورس لازمی طور پر ہونا چاہیے۔ طلبہ اور اساتذہ میں حریت فکر کو فروغ دینا چاہیے۔ یونیورسٹیوں کی اندر وہی خود مختاری کا احترام کیا جانا چاہیے۔ اور اساتذہ سے فوری اور واقعی سیاست میں دلچسپی لینے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

ایک قوم (Nation) کی حیثیت سے سرور صاحب نے ہمارے سامنے کچھ سوال کھڑے کیے ہیں۔ یہ سوال ملک کے مستقبل کے بارے میں تو ہی دنیا کے مستقبل کے بارے میں بھی ہیں۔ یعنی یہ کہ:

”ہندوستان کہ ہے؟ جمہوریت کے نام پر صارفیت کی ہوئی کی طرف یا حکومت میں عوام کی حقیقی شرکت کی طرف؟ سنتی مغربیت کی طرف یا نئی مشرقت کی طرف جو مغرب سے متاثر ہے مگر مغرب کی اندھی مقلد نہیں ہے؟ آبادی کے بے تحاشا بڑھنے کی طرف یا اس کی رفتار کم کرنے کی حقیقی کوشش کی طرف؟ آمدی میں بڑھتے ہوئے فرق کی طرف یا اس فرق کو کم کرنے اور اس خلیج کو پانے کی طرف؟ مقبولیت کی طرف، Popularism کی طرف یا قومی ضرورت کی طرف؟ لا قانونیت کے بڑھنے کی طرف یا گاؤں کی پاسداری کی طرف؟ مشین کی حکومت کی طرف یا مشین پر حکومت کی طرف؟ ہنرمندی کی

طرف یا مہذب انسان پیدا کرنے کی طرف؟ Aberration کی طرف یا Identification کی طرف؟ یہ بات ہم سب کے سوچنے اور اس سوچ کو مکمل بنانے کی ہے۔<sup>۲۶</sup>

کیا مستقبل کا ہندوستان پروفیسر سرور کے ان سوالوں کے جواب دے گا اور دیگا تو کیسے؟ اس سے متعین ہوگا آزاد ہندوستان کا مستقبل! اس لیے کہ یہ سوالات صرف پروفیسر سرور کے نہیں ہیں۔ ان لاکھوں کروڑوں لوگوں کے ہیں جن کی نمائندگی پروفیسر سرور کرتے ہیں۔

## حوالے

- ۱ پچھلے پیر، جاں شاراختر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۷
- ۲ فکر روشن، آل احمد سرور، ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۵ء، ص ۳۵
- ۳ ایضاً، ص ۱۳۸
- ۴ ایضاً، ص ۱۳۶
- ۵ مضمون 'توازن زندگی اور ادب میں'، آل احمد سرور، مطبوعہ سہ ماہی اردو ادب، علی گڑھ جولائی ۱۹۵۰ء
- ۶ ایضاً
- ۷ ہندوستان کدھر، آل احمد سرور، کے جی سیدین میموریل نرست، دہلی ۱۹۸۳ء، ص ۱۶
- ۸ ہماری زبان، علی گڑھ، کیم جون ۱۹۶۳ء
- ۹ ہندوستان کدھر، آل احمد سرور، کے جی سیدین میموریل نرست، دہلی ۱۹۸۳ء، ص ۱۱-۱۰
- ۱۰ ایضاً، ص ۱۱
- ۱۱ ایضاً، ص ۱۲
- ۱۲ ایضاً، ص ۱۵
- ۱۳ ایضاً، ص ۱۳
- ۱۴ مضمون 'توازن زندگی اور ادب میں'، آل احمد سرور، مطبوعہ سہ ماہی اردو ادب، علی گڑھ، جولائی ۱۹۵۰ء
- ۱۵ ہندوستان کدھر، ص ۱۹
- ۱۶ ایضاً، ص ۱۸

- ۱۷ مضمون 'توازن زندگی اور ادب' میں، از آل احمد سرور، مطبوعہ سہ ماہی اردو ادب،  
علی گڑھ، جولائی ۱۹۵۰ء، ص ۹۲
- ۱۸ فکر روش، آل احمد سرور، ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۵ء، ص ۹۲
- ۱۹ ایضاً، ص ۹۲
- ۲۰ ہندوستانی مسلمان اور مجیب صاحب، ایک تنقیدی جائزہ، آل احمد سرور، مکتبہ جامعہ  
لمیئڈ، نئی دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۲۰
- ۲۱ ایضاً، ص ۳۰-۳۱
- ۲۲ ایضاً، ص ۳۱
- ۲۳ ایضاً، ص ۳۱-۳۲
- ۲۴ ایضاً، ص ۳۲
- ۲۵ مضمون 'توازن زندگی اور ادب' میں، از آل احمد سرور، مطبوعہ سہ ماہی اردو ادب،  
علی گڑھ، جولائی ۱۹۵۰ء، ص ۹۲
- ۲۶ ہندوستان کدھر، ص ۲۸

## تنقید

آل احمد سرور اردو کے ابتدائی نقادوں میں ہیں۔ بقول پروفیسر گوبنی چند نارنگ:

”حالی کے بعد آنے والی نسل میں سرور صاحب سب سے ممتاز نقاد سمجھے جاتے رہے ہیں۔“

ان کے مطابق:

سرور صاحب کے کارناموں کو ان کے علمی پس منظر میں دیکھیں تو ان کی اہمیت اور بھی روشن ہو جاتی ہے۔ سرور صاحب کی پیدائش ۱۹۱۲ء میں ہوئی۔ محمد حسین آزاد دو برس پہلے ۱۹۱۰ء میں رحلت کر چکے تھے۔ شبلی اور حالی کا انتقال دو برس بعد ۱۹۱۳ء میں ہوا۔ نشۃ الثانیہ اور سرید تحریک کے زیر اثر نئی روشنی کی جو لہر آئی تھی اس نے زندگی اور ادب کے تمام شعبوں کو متاثر کیا تھا۔ اسی زمانے میں اردو تنقید کی بنیاد بھی بطور ایک ضابطہ علم کے ڈالی جانے لگی تھی۔ آب حیات کے تحقیقی پہلو سے ہم لاکھ اختلاف کریں، محمد حسین آزاد کی پیشتر تنقیدی آراء آج بھی واقع ہیں۔ موازنہ انیس و دیبر اور شعر الجم میں شبلی کا جو ذہن سامنے آتا ہے وہ بہترین جمالیاتی رچاؤ رکھتا ہے۔ لیکن یہ سعادت صرف حالی کے ہی حصے میں آنے والی تھی کہ مقدمہ شعرو شاعری لکھ کر انہوں نے اردو تنقید کی بحیثیت ضابطہ علم باقاعدہ بنیاد ڈالی۔ ان تینوں کے فوراً بعد مولوی عبدالحق، وحید الدین سلیم اور بعض دوسرے حضرات ہیں جن کی حیثیت نیچ کی کڑی کی ہے۔ ان بنیادوں پر جو انگلوں نے ڈالی تھیں تنقید کے ایوان کو آراستہ کرنے والوں میں بعض اہم نام آتے ہیں۔ مثلاً کلیم الدین احمد، فراق گورکھپوری، اختر حسین رائے پوری، احتشام حسین، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، سید عبد اللہ اور محمد حسن عسکری۔ ان میں سے ہر شخص کا نام اپنی اپنی جگہ واقع ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو بات سرور صاحب میں ہے وہ کسی دوسرے میں نہیں۔“

اس تاریخی تناظر پر اصرار کے یہ معنی بالکل نہیں ہیں کہ سرور صاحب کی اہمیت محض

تاریخی ہے۔ گویہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جولائی ۱۹۳۱ء، (رسالہ تفہیم، آگرہ) سے ان کی تحریریں ہمیں رسالوں میں ملنے لگتی ہیں۔ اور اپنی زندگی کے آخری دنوں تک وہ تصنیفی اور تاریخی اعتبار سے فعال رہے ہیں۔ فعال ماہیہ بھلے ہی نہ رہے ہوں۔

بڑے نقاد کی پہچان بقول شمس الرحمن فاروقی یہ ہے کہ (۱) اس کا ادبی سرمایہ وافر ہو۔ (۲) بیشتر معاملات میں اس کی اپنی رائے ہو اور (۳) اس کے یہاں ایک مرتب اور مربوط نظام فکر پایا جاتا ہو۔ آل احمد سرور اس نقطہ نظر سے ہمارے چند بڑے نقادوں میں ہیں۔ اپنے طویل زمان کار میں سرور صاحب نے مختلف موضوعات پر اپنے خیالات کا کمثرت اظہار کیا ہے۔ یوں ان کا تنقیدی سرمایہ اپنے دوسرے معاصرین کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ اکثر و بیشتر معاملات میں ان کی اپنی تنقیدی رائے بھی ہے جن سے اتفاق یا اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن انھیں انداز کر کے آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔ ان کی تمام رائیں ایک مخصوص تنقیدی نظام کا حصہ ہیں جسے بعض ناقدین نے آشتی پسندانہ (Accommodative)، بعض نے کشادگی قلب پر مبنی انسانیت پسندانہ (Liberal Humanist) اور بعض نے عقل عامہ پر مبنی تنقید سے تعبیر کیا ہے۔

ان تمام رائیوں کے نیچے جو بات خاص طور سے نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ادب کا ایک کشادہ نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”ادب کا لفظ صرف سرمایہ تحریر کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ مفہوم بہت عام ہے۔ اردو میں سائنس کا ادب بہت کم ہے اور مغربی ادب کا اثر ہمارے اوپر اچھا پڑا ہے، پہلے جملے میں ادب سے سرمایہ تحریر مراد ہے اور دوسرے میں بہترین دماغوں کے بہترین کارنامے بھی۔ ہاں ادب اور سائنس میں فرق کرنے کے لیے ادب کا ایک مخصوص اور جانا پہچانا مفہوم ہے۔ اس جانے پہچانے مفہوم کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ اسے ساری دنیا سے الگ ایک مقدس اور اطیف چیز سمجھ لیا گیا ہے جو ذرا سی گرد سے میلی ہو جاتی ہے اور ذرا سا وزن برداشت نہیں کرتی۔ ادب کا یہ زم و نازک تصور اس دور کی یادگار ہے جب نرمی و نزاکت تہذیب کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اور تہذیب صرف اس فارغibal طبقہ کی جا گیر تھی جو نرمی و نزاکت سے محیل سکتا تھا۔ ادب برائے

ادب کا تصور زیادہ تر اسی ناقص تہذیبی تصور کی یادگار ہے اور کوئی سمجھدار آدمی ادب برائے ادب کا قائل نہیں۔ اس لیے ادب اور زندگی کا تعلق ضروری سمجھا گیا ہے۔ مگر اس تعلق میں اب بھی برابری کا احساس شامل ہے۔ حالانکہ ادب اور زندگی کا تعلق جزو کل کا تعلق ہے۔ ادب نے انسانیت کی ترقی اور زندگی کی بہتری میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں مگر ساری زندگی ادب نہیں ہے اور موجودہ دور میں جبکہ سائنس کے ذریعے سے ادب زندگی کے امکانات کو وسیع کرنے اور زندگی کے سمندر سے خوبصورت سے خوبصورت موتی نکالنے کا متوقع ہے ادب کو زندگی کا خادم اور سیاست کا رفیق سمجھنا ضروری ہے۔ رفاقت اور غایمی میں فرق ہے۔ ادیب کے لیے ذاتی آزادی ضروری ہے اور آقا اور غلام کا رشتہ بھی صحیح مند نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے ادب اور سیاست کی رفاقت کو زندگی کے لیے فال نیک اور مستقبل کے لیے اچھا شکون کہا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ادیب ارباب سیاست کی مصلحتوں اور وقتی ضروریات کا پابند نہیں ہے۔ وہ چونکہ ساری زندگی کا باپاں اور ایک حکیمانہ تصور کا مالک سمجھا جاتا ہے اس لیے اسے اس بات کا حق ہے کہ آئے دن کے سیاسی ادکام کے خلاف سوچ، سمجھے اور لکھئے۔ اسے سماج سے بغاوت کا حق حاصل ہے۔ اسے محدود جغرافیائی تصورات سے آگے دیکھئے اور ہر چیز کو انسانی قدروں سے پر کھنے کی اجازت ہے۔ کوئی نظام سیاست اسے اس طرح پابند نہیں کر سکتا۔ وہ جب ایک بہت بڑی ذمہ داری کا امین اور رازدار ہے تو بعض اوقات چھوٹی چھوٹی ذمہ داریوں سے آزاد بھی ہو سکتا ہے۔ ادب کی یہ آزادی اگر اسے نرماج اور مطلق العنانی کی طرف لے جائے تو وہ ادیب نہیں رہ جاتا۔ اور اگر اسے انسان دوستی کی نعمت حاصل ہے تو پھر وہ بعض روایات سے باقی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ وہ ہر حال میں اپنے خلاف سننے کو تیار رہتا ہے۔ انطباق خیال پر پابندی ادیب کے لیے ذاتی موت کے مترادف ہے۔ بعض نازک موقعوں پر زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں بھی احتساب ہو سکتا ہے۔ مگر ساری زندگی کو نازک لمحات کا سلسلہ نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے عام طور پر احتساب کو گوارا نہیں کیا جاسکتا۔<sup>۱۲</sup>

وہ ادب کی ادبیت، مقصدیت، اس کی اخلاقی قدروں اور سماجی قدروں پر بار بار اصرار کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ادب کے مطالعہ اور اس کی تغیید میں سب سے پہلی بات

یہ ہے کہ کوئی تحریر ادب ہے یا نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی تحریر کی عظمت کا تعین تو اس کے غیر ادبی معیاروں سے ہی ہوگا لیکن اس بات کا تعین کہ کوئی فن پارہ ادب ہے یا نہیں تو ادبی معیاروں سے ہی ہوگا۔ وہ ہر رنگ میں بہار کا اثبات تلاش کرتے ہیں۔ وہ جہاں ایک طرف ادب کی ابدی اور دائمی قدروں کے قابل ہیں وہیں وقتی ادب یا ادب کی وقتی ضرورتوں کا احساس بھی رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق:

”کبھی کبھار انگریزی کے ادبی اخباروں اور رسالوں میں ایسی بحثیں اور تقریبیں نظر آتی ہیں جن سے متشرع ہوتا ہے کہ موجودہ واقعات پر نظمیں لکھنا اور عوام کو جنگ کے لیے ابھارنا ادب نہیں کچھ اور ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کچھ لوگ یہ بات اس لیے کہتے ہیں کہ ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے تاثرات نظموں یا مضامین کی شکل میں ضرور ہی ظاہر کر دیں۔ دراصل یہ توقع صحیح نہیں ہے۔ ادیب متاثر تو ہوتا ہے مگر تاثر کا اظہار اپنے طور پر کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس تاثر کو اپنے طور پر ظاہر کرے۔ کسی ادیب کے یہاں یہ تاثر صرف دھن کی عظمت کے ایک راگ کی شکل میں نظر آئے، کسی میں ہمایہ کی بلندی کے سمبل کی پرستش کی شکل میں، کسی میں سادہ اوجی اور دوسروں کے وعدوں پر جلد اعتبار کرنے پر ظریف کی شکل میں، کسی کے یہاں تاریخ ہند کے ایسے مقامات، مراحل اور مشاہیر کو خراج عقیدت میں جو ہندوستان کی آزادی اور اس کی عزت کے لیے عمر بھر لڑتے رہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ادیب اور شاعر اپنے طور پر اپنی بات کہتا رہے اور اس کے ساتھ ساتھ قومی بچاؤ کے کاموں میں عملی حصے کے لیے بھی وقت نکالے۔ چندہ جمع کرے، تبذیبی پروگراموں میں مدد دے، اپنی کتابیں جوانوں کے پڑھنے کے لیے بھیجیے، ملک کے ضبط و نظم میں مدد دینے کے لیے خود اپنے مطالبات کم کرے اور کام زیادہ۔ وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ سرحد کی حد بندی، میک ماہن لائیں، لداخ اور نیغا کی تاریخ، چینی تاریخی، چینیوں کے مزاج پر ایسے مضامین لکھے جن سے لوگ نہ صرف دھن کو اچھی طرح پہچان جائیں بلکہ اپنے قومی موقف سے اور زیادہ باخبر ہو جائیں۔ اس کا یہ کام بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آزادی کی محبت کو اور جاگزیں کرنے کے لیے آزاد قوموں کی مثالیں سامنے لائے۔ دوسری قوموں نے مشکلات کا جس طرح مقابلہ کیا ہے

اور جس جدوجہد کے بعد منزل مقصود تک پہنچی ہیں اس کی مصوری کرے، غرض کرنے کے بہت کام ہیں۔<sup>۱۰۵</sup>

وہ ادب کے ساتھ ساتھ ادیب کے روں کے سلسلہ میں بھی بہت واضح خیالات رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

”ادیب آخر شہری بھی تو ہے۔ اور شہری کی حیثیت سے اس کے جو فرائض ہیں وہ اسے ہر طرح بجالانے ہیں۔ مگر اس میں اور عام شہری میں فرق یہ ہے کہ وہ زیادہ باشур شہری ہے۔ اس کا ذہن زیادہ بیدار اور مرتب ہے۔ وہ چونکہ خود بھی عام لوگوں سے زیادہ بصیرت رکھتا ہے اس لیے انہیں بھی دوسروں سے زیادہ بصیرت دے سکتا ہے۔ پھر چونکہ وہ ممتاز شہری ہے، اس کی عزت اور قدر ہوتی ہے، اس کے پڑھنے والے اس کی رائے کو اہمیت دیتے ہیں اس لیے اس کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی اس گہری اور مخصوص بصیرت کو بھی عام کرے اور عام لوگوں کو ہر منزل پر قیادت بھی کرے۔ برنا روشن اہر واقعہ پر ڈرامائیں لکھتا تھا۔ اکثر کسی خاص واقعہ پر اس کے اثرات ایک بیان کی شکل میں شائع ہوتے تھے یا نامحس کو خط کی شکل میں۔ پھر عام رائے کو بنانے میں یہ خط اور بیان بھی ایک اہم آله ہوتا تھا۔ اسی طرح کوئی مشہور شاعر، ناولست، افسانہ نگار، نقاش، مورخ، فنکار، دانشور، سائنس دان جب کسی مسئلے پر رائے دیتا ہے تو وہ رائے بھی رائے عامہ کے بنانے میں معاون ہوتی ہے۔ اس لیے ادیبوں سے یہ مطالبه صحیح ہے کہ وہ اس قومی ہنگامی حالت میں عوام کی رہبری کریں اور ان کے عزم و ارادے کو ایک آہنی دیوار بنادیں۔ مگر یہ مطالبه صحیح نہیں ہے کہ نظم یا کہانی یا مضمون کی شکل میں اپنے تاثر کا اظہار ضرور کریں بلکہ اسے اپنے طور پر اپنی بات کہنے دیں اور اسے اپنے کرنے کے کام خود ڈھونڈنے دیں۔ ایک کام سے دوسرے کام تک وہ خود پہنچے گا۔<sup>۱۰۶</sup>

آزادی اور ذمہ داری کی یہ کشمکش سرور صاحب کے پورے تفصیدی سرمایہ میں نظر آتی ہے۔ وہ زندگی اور ادب کو الگ الگ نہیں کرتے۔ اسی لیے نیب الرحمن کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا حوالہ دینا بھی نہیں بھولتے کہ :

”نیب الرحمن صاحب کی یہ خصوصیت مجھے بہت عزیز ہے کہ وہ شاعر محض نہیں ہیں۔ وہ سماجی کاموں میں بھی گہری دلچسپی لیتے ہیں اور زندگی سے ان کا ربط و

تعلق بہت وسیع اور گہرا ہے۔<sup>۷</sup>

انھوں نے بہت واضح طور پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ:

”ادب زندگی کی تحلیقی ترجمانی ہے۔ اس ترجمانی میں حسن کاری مضمرا ہوتی ہے۔

یہ ترجمانی خلا میں نہیں بلکہ اپنی سرزمیں، اپنی فضا، اپنے تہذیبی نقش و نگار اور اپنے سماجی آئین کے مطابق ہوتی ہے۔“<sup>۸</sup>

وہ مزید لکھتے ہیں:

”میں ادب کا مقصد نہ ہنی عیاشی سمجھتا ہوں نہ اشتراکیت کا پرچار۔“<sup>۹</sup>

یہی حال تنقید کے بارے میں ان کے خیالات کا ہے۔ I.A. Richards کے حوالے سے نقاد کی تین خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ایک اچھے نقاد میں تین خوبیاں ہوتی چاہیں۔ اس ہنی کیفیت تک پہنچنا جو مصنف یا تصنیف کی ہے، تجربات اور تجربات میں امتیاز کرنا تاکہ ان کی قدر، قیمت کا اندازہ ہو سکے، قدروں کا نباض ہونا۔“<sup>۱۰</sup>

وہ مختلف تنقیدی دبستانوں کے نقطہ افتراق کے بجائے نقطہ اشتراک پر زور دیتے ہیں اور کسی ادبی فن پارہ کے لیے انفرادیت، خارجیت اور عصریت تینوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک شدت پسندی اور انتہا پسندی کے بجائے معقولیت اور توازن (Sanity and Normality) ضروری قدر ہیں۔ ان کے مطابق:

”نقد حیات اور ادب کا نباض ہوتا ہے۔ وہ اعلیٰ قدروں کا عارف اور اس کا ناشر ہوتا ہے۔“<sup>۱۱</sup>

”ادبی نظریہ زندگی کے کسی بڑے فلسفے پر مبنی ہوتا ہے۔ ادب کے دو بڑے پہلو تسلیم کیے گئے ہیں۔ ایک اخلاقی دوسرا جمالیاتی۔ غور سے دیکھا جائے تو اخلاقی پہلو کے پیچے کوئی فلسفہ ہوتا ہے۔ جمالیاتی پہلو کے پیچے حسن کاری اور فن کا ایک احساس ہوتا ہے۔ اگر کوئی نقاد صرف اخلاقی پہلو کو دیکھتا ہے یا صرف انکار پر توجہ کرتا ہے اور فن کے جادو اور حسن کا راز معلوم نہیں کرتا تو وہ اپنے منصب کو نہیں پہچانتا۔ اسی طرح جو نقاد فن کے پیچ میں الجھ جاتا ہے، فن کے بدلتے ہوئے شعور کو نہیں دیکھتا، الفاظ کی صحت، غلطی میں چلن کے تصرف کو نہیں سمجھتا وہ روایتی تنقید کرتا ہے۔ میرے نزدیک فلک و فن کے رشتے کو سمجھتے ہوئے بھی

دونوں کا الگ الگ احساس اور دونوں کا محاکمہ ہر نقاد کے لیے ضروری ہے۔<sup>۱۱</sup>

”موجودہ دور کے نقاد کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ ادبی تاریخ کو نظر میں رکھتے ہوئے شخصیت اور ماحول دونوں کی روشنی میں فکر و فن کے روزگار پتہ چلائے اور ان کی قدر و قیمت معین کرے۔“<sup>۱۲</sup>

”نقد و قدر و قیمت معین کے تعین میں عدالتی فیصلے سے بچتا ہے۔ وہ حکم نہیں دیتا۔ وہ بہترین ناموں کی فہرست مرتب نہیں کرتا۔ نہ وہ پستی کے درجے متعین کرتا ہے۔ وہ ذوق سلیم کی روشنی میں قبل قدر، معنی خیز اور بصیرت انگیز تحریفات کا پتہ چلااتا ہے۔ ان پر غور کرتا ہے اور دوسروں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔“<sup>۱۳</sup>

کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب 'اردو تنقید پر ایک نظر' میں آل احمد سرور پر یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ اقداری فیصلے Value Judgement سے بچتے ہیں۔ یہ بات خود سرور صاحب نے بھی تسلیم کی ہے اور ان کے خیال میں نقاد کا یہ منصب بھی نہیں ہے کہ وہ عدالتی فیصلے کرے۔ لیکن اس کے باوجود سرور صاحب کی تنقید میں اقدار کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ بار بار اس بات کا ذکر کرتے ہیں:

”اچھی تنقید کی قدریں مہذب انسانیت کی قدریں ہی ہوتی ہیں۔“<sup>۱۴</sup>

”ہر اچھی تنقید ادب کی بقا اور ترقی کے لیے کچھ سماجی، اخلاقی اور جمالياتی قدر و قیمتی ہے۔ اس کے لیے انسانیت اور تہذیب کا ایک جامع شعور درکار ہے۔“<sup>۱۵</sup>

وہ اس نظام اقدار کو نظام اخلاق کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

”اردو ادب میں سب سے پہلا وہ نظام اخلاق نظر آتا ہے جو صرف ہندوستانی نہیں ہے بلکہ جس میں یونان، عرب و یونان اور وسط ایشیا کی صدیوں کی رسم و راہ منزل ملتی ہے۔ اس نظام اخلاق کا ایک مذہبی پس منظر بھی ہے۔ مگر شاید ہندوستان میں آتے آتے حسن فلسفہ تصوف کا علمبردار ہوا۔ وہ اتنا مذہبی نہیں جتنا اخلاقی ہے۔ قدیم ادب میں تصوف اور اخلاق قدر مشترک ہے۔ مگر جدید ادب میں صرف اخلاق قدر مشترک رہ گیا ہے۔ اردو ادب بحیثیت مجموعی ہر دور میں اخلاقی نقطہ نظر کا ہیرہ رہا ہے۔ قدیم دور میں اخلاق فرد کی تہذیب و شائستگی کا ضامن تھا۔ جدید ادب میں فرد کی تہذیب کے ساتھ سماجی خیر کا مسئلہ بھی

اگیا ہے۔ یوں تو قدیم ادب ترک دنیا سمجھاتا ہے اور جدید ادب دنیا سے ایک  
بخت مندر شستے، مگر دنیا ہر دور میں ادیب کے دامن سے لمبی ہوئی ہے۔ یہ ہر  
دور میں سنتی شہرت، طلبی خیالات، ذاتی مفہود کے خلاف ہے۔ اس میں ایک  
انسان دوستی، باہمی روابط اور ایک دنیوی دین کا تصور برابر ملتا ہے۔ یہ زندگی  
میں ایک لگن، ایک دھن، ایک جذب، ایک سرمستی کا قابل ہے۔ یہ ترکیہ نش  
سمحتا ہے۔ کائنات کا ہر مظہر ایک حسن سمجھاتا ہے۔ ہر کثرت میں ایک وحدت  
ہے۔ اس وحدت کی تلاش، اس کو پانے کے لیے اپنے آپ کو کھو دینا، اس کی  
خاطر ہڑی سے بڑی آزمائش سے گزرنا، اور اس کی راہ میں ہڑی سے بڑی  
قربانی کرنا ضروری ہے۔ اس کی خاطر جینا عبادت اور اس کی راہ میں مرنا  
شہادت ہے۔

یہ وہ بنیادی تصورات ہیں جو سرور صاحب کی تنقید کی رگ و پے میں سرایت کے ہوئے ہیں۔ اسی لیے وہ میر کے قائل ہیں، غالب کے قائل ہیں، اکبر کے قائل، اقبال کے قائل ہیں، اصغر کے قائل ہیں، فانی کے قائل ہیں، جگر کے قائل ہیں، حضرت کے قائل ہیں۔ اسی لیے وہ میر کے ان اشعار کا بار بار حوالہ دیتے ہیں ۔

اے آہو ان کعبہ نہ ایندھرم کے گرد کھاؤ کسی کا تیر کسی کا شکار ہو

بھم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے پہر اس شوخ کو بھی راہ پر لانا ضرور تھا

کھا گیا نشتر سر تیز جگر دل دونوں رات کی سینہ خراشی میں بہرہم نے کیا

منعم کے پاس قائم و سنجاب تھا تو کیا اس رند کی بھی رات گذر گئی جو عورت تھا

شہاں کے کھل جواہر تھی خاک پا جن کی انھوں کی آنکھوں میں پھرتی سلاسیاں دیکھیں

لے سانس بھی آہتے کہ نازک ہے بہت کام آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

یہ تمام اشعار ان اقدار کی نمائندگی کرتے ہیں جو اردو غزل کی کلاسیکی روایت کا حصہ ہیں۔ اور جس کے بارے میں سرور صاحب نے خود لکھا ہے کہ:

”اردو شاعری میں عشق کے تصور پر آزاد و حالی کے وقت سے برابر اعتراضات کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے اعتراضات صحیح ہیں۔ مگر معتبر نہوں نے اس عشق کے سارے اسرار و رموز کو نہیں سمجھا۔ اس عشق کی بدہالت اردو کا شاعر وادیب پچھر دیا، پچھو عینیت پسند، پچھو جی دار اور جیالا رہا۔ اس عشق نے بھی کبھی آلام روزگار کو آسان بنانا سمجھا یا، کبھی سپید و سیاہ کی سیر میں ایک جلوہ گھوگھی تصور کیچھی سمجھا۔ یہ عشق اسے دیر و حرم سے پرے لے گیا، اس نے اسے زخم کھا کر مسکراتا اور مرمر کر جیے جانا بتایا۔ اس نے اس کے تخیل کو ہوا دی۔ اس نے اپنی بساط اور حوصلے کے مطابق جدن اور تڑپنا، دکھ جھیلنا اور زہر حیات کو رکھنے بنانا سمجھا۔“<sup>۱۸</sup>

لیکن اس کے یہ معنی بالکل نہیں ہیں کہ وہ حالی کی طرح فن کو اخلاق کا نائب منابع سمجھ کر، پچھ کر لوں جوانو اٹھتی جوانیاں ہیں، کی نصیحت کرتے ہیں، بلکہ وہ صاف کہتے ہیں کہ: ”فن اخلاق کا نائب منابع نہیں ہے۔ فن خود اخلاق ہے۔ فن کسی خاص زمانے کا صحیح اخلاق نہیں ہوتا۔ مگر وہ اپنی بلندی میں ہمیشہ اخلاقی ہوتا ہے۔ اس طرح فن کو سماجی و ستاویز ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر فن میں ایک سماجی بصیرت ہوتی ہے جو علوم سے حاصل کی ہوئی فکر کو انسانی تجربے سے مربوط کر کے ہمیں اپنے طور پر سماج کی روح سے آشنا کرتی ہے۔“<sup>۱۹</sup>

حسن، نیکی اور خیر کے انہیں تصوارت کی وجہ سے آل احمد سرور کی تنقید کا بڑا اور قابل قدر سرمایہ وہ ہے جو کلاسیکی شاعری کے گرد گھومتا ہے۔ یوں تو وہ میر، سودا، درد، انیس، نظیر اور دوسرے شعراء و ادباء کی اہمیت کے بھی قائل ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی بہترین تنقیدی صلاحیتیں غالب اور اقبال کی تفہیم و تحسین میں ہی صرف ہوئی ہیں۔ غالب پر سرور صاحب کی درجن بھر سے زیادہ تحریریں ملتی ہیں۔ ان تحریریوں میں انہوں نے غالب کی جدت پسندی، ان کی تشكیک، ان کی سوالیہ نشان قائم کرنے کی صلاحیت اور ان کی شخصیت کی پبلوداری پر زور دیا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے اپنے مضمون، ” غالب، جدید ذہن اور آل احمد سرور“ مطبوعہ فکر و نظر، علی گڑھ سرور نمبر میں سید احتشام حسین کی غالب فہمی

کے مقابلے میں سرور صاحب کی غالب فہمی کو جدید ذہن کے زیادہ قریب اور شعر و ادب کی تفہیم و تحسین کے لیے زیادہ موزوں قرار دیا ہے۔

بلاشبہ سرور صاحب کی سب سے زیادہ تحریریں اقبال سے متعلق ہیں۔ وہ اقبال کے ابتدائی ناقدین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھیں اقبال کی زندگی میں ہی ان پر مضمون لکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا اور صرف ایک مرتبہ ہی سہی لیکن اقبال سے ان کی خط و کتابت بھی رہی۔ انھوں نے اقبال کے فکر و فن کے حوالے سے پوری اردو شاعری، ہندوستانی مسلمان، موجودہ عہد، اسلام اور ہر اس موضوع پر لکھا ہے جس سے اقبال کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ اقبال سے متعلق ان کے مضمایں کا ایک مجموعہ صداق جاوید نے مکتبہ عالیہ لاہور سے ۱۹۷۷ء میں 'اقبال اور ان کا فلسفہ' کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس میں آنحضرت مضمایں شامل تھے۔ اسی سال زہرا معین نے 'عرفان اقبال' کے نام سے سرور صاحب کے مضمایں کا دوسرا مجموعہ شائع کیا۔ دونوں میں بعض مضمایں مشترک اور بعض نئے ہیں۔ ان مضمایں کے علاوہ زہرا معین نے سرور صاحب کی منتشر تحریریوں سے اقبال سے متعلق سرور صاحب کے اقتباسات اور سرور صاحب کے نام اقبال کا خط بھی نقل کیا ہے۔ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۷ء کے درمیان لکھے گئے مضمایں کا تیسرا مجموعہ 'انشور اقبال' کے نام سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا جس میں بیکھرے گئے ہیں۔ ان تحریریوں کے علاوہ 'اقبال نظریہ اور شاعری' کے عنوان سے دہلی یونیورسٹی میں دیے گئے نظام خطبات اور کشمیر یونیورسٹی میں دیا گیا خطبه 'اقبال کے مطالعے کے تناظرات' بھی اہم ہیں۔ رامپور کے یوم اقبال اور اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر کے سمیناروں کے مضمایں کے مجموعے ان کے علاوہ ہیں۔

اس پورے سرمایہ کے بارے میں پروفیسر جگن ناٹھ آزاد ہی یہ رائے بہت متوازن ہے کہ:

"ہندوستان میں آزادی سے پہلے بھی اقبال پر متوازن مضمایں لکھنے والوں میں آل احمد سرور کا نام خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اب مجھے یہ تو یاد نہیں کہ آزادی کے بعد ایک دو سال کے اندر سرور صاحب نے کون کون سے مضمایں لکھے لیکن ان مضمایں کو اہل نظر نے بہیش قدر اول کے مضمایں سمجھا ہے اور آج بھی علامہ

اقبال کے بارے میں ان کی تحریریں مینار نور کی حیثیت رکھتی ہیں۔<sup>۱۹</sup>

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے بھی ان مضامین کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”نبیس معلوم کہ علامہ اقبال کے مشورے کے مطابق سرور صاحب نے تھائیں

اسلامیہ سے کتنی واقفیت بھم پہنچائی مگر ان کی بعد کی تحریریں سے ثابت ہوتا ہے

کہ انہوں نے اقبال کو حتی الامکان پورے سیاق و سبق میں دیکھنے اور سمجھنے کا

سلسلہ جاری رکھا۔ اس باعث مجنوں گورکھوری یا ان کی قبیل کے بعض دوسرے

ترقی پسند نقادوں کے اس کھوکھے پن کو سمجھنے میں وہ کامیاب ہوئے کہ اقبال

کے یہاں شاہین کے استعارے پر زور اور جال کی صفت پر اصرار گو یا فسطائی

رویے کی نمائندگی کرتا ہے۔ سرور صاحب نے بجا طور پر اس بات کی وضاحت

کی کہ جال کے ساتھ جمال، عقل کے ساتھ عشق اور طاقت کے جبروت کے

ساتھ فقر و قناعت کیونکہ انسان کامل کے ترکیبی عناصر بن جاتے ہیں۔<sup>۲۰</sup>

یہ بات قابل ذکر ہے کہ سرور صاحب نے جس طرح اقبال کی عظمت کے مختلف پہلوؤں، موجودہ دور میں ان کی معنویت، اردو نظم کی تاریخ میں ان کے کارنامے، اردو غزل کی روایت میں ان کے اضافے، ان کی شاعری میں خطابت کے عناصر کی موجودگی کی وجہ سے کلیم الدین احمد کے اعتراضات کی روشنی میں شاعری میں خطابت کے رول، جواز اور رشتہ کے حوالے سے اقبال کی شاعری کی اہمیت اور قدروں کے بھرمان کے حوالے سے اقبال پر جو مضامین لکھے ہیں وہ یقیناً اقبال تقدیم میں اہم اضافہ ہیں۔

آل احمد سرور کی تقدیم کے سلسلہ میں یہ بات بھی اہم ہے کہ عام تقدیمی رویے کے برخلاف انہوں نے اپنے آپ کو محض شاعری کے مطالعے تک محدود نہیں رکھا۔ شاعری کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے انہوں نے نظر کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا۔ اور حالی، سر سید اور آزاد سے لے کر سجاد انصاری، مہدی افادی، رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی تک کی نشر کو اپنے مطالعات کا موضوع بنایا۔ جہاں انہوں نے نظم کی زبان پر گفتگو کی وہیں نظر کے اشائیں پر بھی اپنے مخصوص انداز میں قلم اٹھایا۔ اگر ایک طرف شاعری میں شخصیت کے عنوان سے خاصاً بسیط مضمون لکھا تو خطوط میں شخصیت کا عنوان بھی ان کی توجہ سے محروم نہیں رہا۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شعر و ادب کی شاید ہی کوئی صنف ایسی ہو جسے انہوں نے اپنی تنقید کا ہدف نہیں بنایا ہو۔ ہر میدان میں انہوں نے اپنے نقوش ثبت کیے ہیں۔ اور یہ نقوش ایسے ہیں جن سے اتفاق یا اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن اسے نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔

## حوالے

- ۱ آل احمد سرور، دانشور، نقاد و شاعر، ترتیب و ترجمیں: شاہد مابلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، ننی دبلی ۷۱۹۹۰، ص ۲۸
- ۲ ایضاً، ص ۲۸
- ۳ سه ماہی اردو ادب، علی گڑھ، جولائی ۱۹۵۰، ص ۱۵
- ۴ اداریہ بھارتی زبان علی گڑھ، ۲۲ دسمبر ۱۹۶۲
- ۵ ایضاً ۲۲ دسمبر ۱۹۶۲
- ۶ مذکوب الرحمن کے مجموعہ 'بایزید' کی رسم اجرا کے موقع پر تقریر بہ مقام علی گڑھ، مطبوعہ بھارتی زبان، علی گڑھ، ۸ فروری ۱۹۶۶
- ۷ کچھ خطے کچھ مقالے، آل احمد سرور، ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶، ص ۹۸
- ۸ نئے اور پرانے چراغ، آل احمد سرور، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۷۸۱۹۹۷، ص ۷
- ۹ ایضاً، ص ۸
- ۱۰ ایضاً، ص ۱۳
- ۱۱ ایضاً، ص ۱۳
- ۱۲ ایضاً، ص ۱۳
- ۱۳ ایضاً، ص ۱۳
- ۱۴ ادب اور نظریہ، آل احمد سرور، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۵۳، ص ۵
- ۱۵ ایضاً، ص ۷
- ۱۶ کچھ خطے کچھ مقالے، آل احمد سرور، ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۶، ص ۹۹
- ۱۷ ایضاً، ص ۱۰۱

- ۱۸ مسروت سے بصیرت تک، آل احمد سرور، مکتبہ جامعہ لمیونڈ، ننی دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۹۱
- ۱۹ ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد اور دوسرے تو سیمعی یکچھر، پروفیسر جگن ناٹھ آزاد، مکتبہ علم و دانش، لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۱۲
- ۲۰ فکر و نظر، علی گڑھ، سرور نمبر، ص ۱۷۵

## کتابیات

### (الف) مطبوعات آل احمد سرور

#### I تصانیف

- ۱ سلسلہ (شعری مجموعہ) علی گزہ، ۱۹۳۵ء
- ۲ تنقیدی اشارے (تنقیدی مضمایں) علی گزہ، ۱۹۴۲ء، پہلا ایڈیشن  
تنقیدی اشارے (تنقیدی مضمایں) نگاربک انجمنی، لکھنؤ ۱۹۴۹ء، دوسرا ایڈیشن  
تنقیدی اشارے (تنقیدی مضمایں) ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۵۵ء، تیسرا ایڈیشن  
تنقیدی اشارے (تنقیدی مضمایں) ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۶۳ء، چوتھا ایڈیشن  
تنقیدی اشارے (تنقیدی مضمایں) اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۶۳ء، پاکستانی ایڈیشن
- ۳ نئے پرانے چراغ (تنقیدی مضمایں) ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۴۶ء، پہلا ایڈیشن  
نئے پرانے چراغ (تنقیدی مضمایں) اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۱ء، پاکستانی ایڈیشن  
نئے پرانے چراغ (تنقیدی مضمایں) ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء، دوسرا ایڈیشن  
نئے پرانے چراغ (تنقیدی مضمایں) ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، تیسرا ایڈیشن
- ۴ نئے پرانے چراغ (تنقیدی مضمایں) ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء، چوتھا ایڈیشن  
تنقید کیا ہے (تنقیدی مضمایں) کتابی دنیا، نئی دہلی ۱۹۴۱ء، پہلا ایڈیشن  
تنقید کیا ہے (تنقیدی مضمایں) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۵۲ء، دوسرا ایڈیشن  
تنقید کیا ہے (تنقیدی مضمایں) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۵۵ء، تیسرا ایڈیشن  
تنقید کیا ہے (تنقیدی مضمایں) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۵۹ء، چوتھا ایڈیشن

- تلقید کیا ہے (تلقیدی مضمایں) مکتبہ جامعہ لمبیڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، پانچواں ایڈیشن
- تلقید کیا ہے (تلقیدی مضمایں) مکتبہ جامعہ لمبیڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، چھٹا ایڈیشن
- تلقید کیا ہے (تلقیدی مضمایں) مکتبہ جامعہ لمبیڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ساتواں ایڈیشن
- ۵ ادب اور نظریہ (تلقیدی مضمایں) ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۳ء، آٹھواں ایڈیشن
- ۶ ذوق جنوں (شعری مجموعہ)، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء، پہلا ایڈیشن
- ۷ نظر اور نظریہ (تلقیدی مضمایں) مکتبہ جامعہ لمبیڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۳ء، پہلا ایڈیشن
- نظر اور نظریہ (تلقیدی مضمایں) مکتبہ جامعہ لمبیڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء، دوسرا ایڈیشن
- ۸ مسرت سے بصیرت تک (تلقیدی مضمایں) مکتبہ جامعہ لمبیڈ، دہلی، ۱۹۷۲ء، پہلا ایڈیشن
- ۹ اقبال نظریہ اور شاعری (خطبہ) شعبۃ اردو، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۷۹ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۰ پہچان اور پرکھ (تلقیدی مضمایں) مکتبہ جامعہ لمبیڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۱ خواب باقی ہیں (سوانح) ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۱ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۲ خواب اور خلش (شعری مجموعہ) مکتبہ جامعہ لمبیڈ، دہلی، ۱۹۹۱ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۳ دانشور اقبال (تلقیدی مضمایں) ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۳ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۴ فکر روش (تلقیدی مضمایں) ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۵ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۵ کچھ خطے کچھ مقاالے (تلقیدی مضمایں) ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۶ اردو تحریک (اداریہ) ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۹ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۷ افکار کے دیے (اداریہ) ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۰ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۸ آل احمد سرور کے تبصرے، مرتبہ محمد ضیاء الدین انصاری، خدا بخش لاہوری، پٹنہ، ۲۰۰۳ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۹ مکاتیب سرور، مرتبہ انجینئر وارث رفیع، لکھنؤ، ۲۰۰۳ء، پہلا ایڈیشن

## II ترتیب :

- ۱ انتخاب جدید
- ۲ پاشٹرائک عزیز احمد، انجمن ترقی اردو (ہند)، اورنگ آباد ۱۹۸۳ء، پہلا ایڈیشن
- ۳ مقالات یوم اقبال، رضا انٹر کانج، رامپور، ۱۹۸۵ء، پہلا ایڈیشن
- ۴ تنقید کے بنیادی مسائل شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۷۱۹۶ء، پہلا ایڈیشن
- ۵ جدیدیت اور ادب شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۶۹ء، پہلا ایڈیشن
- ۶ عکس غائب شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۶۹ء، پہلا ایڈیشن
- ۷ اردو فلکشن شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۳۷۱۹ء، پہلا ایڈیشن
- ۸ اقبال اور تصوف، اقبال انسٹی ٹیوٹ، سرمی نگر، ۱۹۸۰ء، پہلا ایڈیشن
- ۹ اقبال اور مغرب، اقبال انسٹی ٹیوٹ، سرمی نگر، ۱۹۸۱ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۰ تشخیص کی تلاش کا مسئلہ اور اقبال، اقبال انسٹی ٹیوٹ، سرمی نگر، ۱۹۸۳ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۱ جدیدیت اور اقبال، اقبال انسٹی ٹیوٹ، سرمی نگر، ۱۹۸۵ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۲ اقبال اور اردو نظم، اقبال انسٹی ٹیوٹ، سرمی نگر، ۱۹۸۶ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۳ ہندوستان میں تصوف، اقبال انسٹی ٹیوٹ، سرمی نگر ۷۱۹۸ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۴ اردو شعریات، اقبال انسٹی ٹیوٹ، سرمی نگر، ۷۱۹۸ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۵ جدید دنیا میں اسلام، اقبال انسٹی ٹیوٹ، سرمی نگر ۷۱۹۸ء، پہلا ایڈیشن
- ۱۶ اقبال انسٹی ٹیوٹ، سرمی نگر، پہلا ایڈیشن Islamic Resurgence
- ۱۷ اقبال انسٹی ٹیوٹ، سرمی نگر، پہلا ایڈیشن Modernity and Iqbal
- ۱۸ اقبال انسٹی ٹیوٹ، Islam in the Modern World، سرمی نگر، پہلا ایڈیشن
- ۱۹ رشید احمد صدیقی کے خطوط، ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶ء، پہلا ایڈیشن
- ۲۰ خطوط عبدالحق بنام آل احمد سرور، انجمن ترقی اردو (پاکستان)، ۱۹۹۸ء، پہلا ایڈیشن

### III خطبات:

- ۱ اقبال کے مطالعے کے تناظرات، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، ۱۹۷۸ء، پہلا ایڈیشن
- ۲ ہندوستان کدھر، سیدین میموریل ترست، دہلی، ۱۹۸۳ء، پہلا ایڈیشن
- ۳ ہماری تعلیمی صورت حال، اقبال انسٹی ٹیوٹ، سری نگر، پہلا ایڈیشن
- ۴ مجیب صاحب اور ہندوستانی مسلمان، مکتبہ جامعہ لمیڈیا، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء، پہلا ایڈیشن
- ۵ سماجیہ اکیڈمی، دہلی ۱۹۹۲ء، پہلا ایڈیشن Literature: Question and Answer

### (ب) آل احمد سرور پر کتابیں

- ۱ پروفیسر آل احمد سرور۔ حیات اور ادبی خدمات، عابدانسا، ادارہ شعر و حکمت، حیدرآباد، ۱۹۸۰ء، پہلا ایڈیشن
- ۲ تحفۃ السرور، مرتبہ شمس الرحمن فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیڈیا، دہلی ۱۹۸۵ء، پہلا ایڈیشن
- ۳ آل احمد سرور: شخصیت اور فن، امتیاز احمد، ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۷ء، پہلا ایڈیشن
- ۴ آل احمد سرور: دانشور، نقاد اور شاعر، شاہد ماہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء، پہلا ایڈیشن
- ۵ ارمغان سرور مرتبہ اصغر عباس، انجمان ترقی اردو (ہند)، دہلی ۲۰۰۱ء، پہلا ایڈیشن

### (ج) رسائل کے خصوصی شمارے

- ۱ ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی، مرتبہ خلیق انجم، ۱۹۹۲ء
- ۲ سه ماہی فکر و نظر علی گڑھ مرتبہ پروفیسر آذری دخت صفوی، نومبر ۲۰۰۳ء

میں شکر گذار ہوں :

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا

جن کی عنایت و محبت نے مجھ سے یہ کام کرا لیا۔

پروفیسر شہریار

پروفیسر ابوالکلام قاسمی

اور

جناب شافع قدوالی کا

جنہوں نے اس سلسلہ میں منید مشوروں سے نوازا۔

شریک حیات ممزصرت فاطمہ

اور

بیٹے انس احمد کا

جن کے تعاون کے بغیر اس کام کا مکمل ہونا ناممکن تھا۔

ان تمام مصنفین کا

جن کے اقتباسات اس تحریر کا حصہ ہیں۔

آل احمد سرور (2002-1911) کا شمار اردو کے ممتاز نقادوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ نقاد کی حیثیت سے انہوں نے ہر نگ میں بہار کے اثبات کی کوشش کی۔ کلاسیکی سرمایہ پر اصرار کے ساتھ ساتھ جدید ادب کی اہمیت کو بھی سمجھا۔ فن، فنکار اور سماج تینوں کی اہمیت تسلیم کی۔ ادبی اقدار اور سماجی اقدار میں ہم آہنگی تلاش کی۔ فن پارے کے فنی پہلوؤں سے سرد کار رکھتے ہوئے اس کے غیر ادبی پہلوؤں کو بھی اہمیت دی۔

ایک دانشور کی حیثیت سے انہوں نے ملک و قوم کے بنیادی مسائل پر توجہ کی۔ سر سید، اقبال، ابوالکلام آزاد، محمد مجیب، عابد حسین اور ڈاکٹر حسین کی دانشورانہ روایت کو آگے بڑھایا۔ انکار کے دور میں اقرار اور اقرار کے دور میں انکار کی روایت عام کی۔

شاعری میں انہوں نے کلاسیکی اسالیب و موضوعات کے ساتھ جدید تر مسائل و موضوعات کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اور اقبال کی پیامی شاعری کے ساتھ ترقی پسندی کی سرکشی اور بغاوت کو بھی آمیز کیا۔

ادبی صحافی اور اردو تحریک کے رہنماء کی حیثیت سے اردو زبان و ادب کے ہر مسئلہ پر ان کی نظر رہی اور ہر جگہ انہوں نے وزن و وقار، تحمل و برداشتی اور جمہوری طریقوں کی پاسداری کی۔ زرینظر مونوگراف میں معروضیت کے ساتھ ان تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

امتیاز احمد (پ 1969) شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچرر ہیں۔ اس سے پہلے ان کی دو کتابیں 'کاؤش' (1991) اور 'آل احمد سرور: شخصیت اور فن' (1997) شائع ہو چکی ہیں۔

*Aale Ahmad Suroor (Urdu)*  
ISBN 81-260-2074-1      Rs. 25